رضوان اللہ

# تکفیر

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ہر مذہب اور اس کے ماننے والوں کے ہاں کچھ مخصوص اصطلاحات ہوتی ہیں۔ دین اسلام میں اسی طرح کی ایک اصطلاح 'تکفیر' ہے جو مسلمانوں کے علم اور ان کی کلامی بحثوں میں شروع دور سے رائج رہی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص جو اصلاً مسلمان نہیں ہے، یا کسی وجہ سے اب مسلمان نہیں رہا، اُسے باقاعدہ طور پر کافر قرار دے دیا جائے۔ کسی کو کافر قرار دینے کا یہ کام چونکہ اپنی ذات میں نہایت پیچیدہ اور بہت سے مضمرات لیے ہوئے ہے، اس لیے احتیاط پسند طبیعتیں بالعموم اس سے احتراز ہی کرتی رہی ہیں۔ تاہم یہ بھی واقعہ ہے کہ علما کی ایک بڑی تعداد نے نہ صرف یہ کہ اسے روا رکھا، بلکہ اپنے ایمان و اسلام کا ایک ناگزیر تقاضا بھی سمجھا ہے۔ ان میں سے بعض کے ہاں یہ عافیت ضرور رہی کہ انھوں نے اہل قبلہ کی تکفیر کو نامناسب اور ناجائز خیال کیا، مگر ان کی غالب اکثریت نے عقیدے سے انحراف اور ضروریات دین سے انکار کرنے پر اُنھیں بھی کافر قرار دے دینا جائز اور بے حد ضروری جانا۔ بلکہ تاریخ شاہد ہے کہ ابتدائی دور میں وہ حضرات بھی ہوئے کہ جنھوں نے اس کی لَے اس حد تک بڑھا دی کہ وہ محض کبائر کے ارتکاب پر اس کا اطلاق کر دیا کرتے اور پھر یہاں تک چلے جاتے کہ علی اور معاویہ رضی اللہ عنہما جیسے بزرگ صحابہ کو بھی کافر قرار دینے میں لمحہ بھر کی دیر نہ کرتے۔

تکفیر کے متعلق ان معروف آرا کے مقابلے میں ایک رائے وہ ہے جسے آج کے زمانے میں محترم جاوید احمد غامدی نے پیش کیا ہے۔ یہ رائے اس لحاظ سے منفرد ہے کہ اس کے مطابق کسی مسلمان کی تکفیر کرنا تو بہت دور کی بات، کسی

غیر مسلم کو کافر قرار دینا بھی جائز نہیں ہے۔ مزید یہ کہ جو شخص اپنے آپ کو مسلمان کہے، اُسے غیر مسلم قرار دینے کا حق بھی اب کسی فرد یا گروہ، حتیٰ کہ کسی ریاست کو بھی حاصل نہیں ہے۔ موجودہ حالات کے تناظر میں، جب کہ مسلم دنیا میں انتشار اور باہمی جنگ وجدل اپنے عروج پر ہے اور اس سارے عمل میں تکفیر کا مسئلہ کلیدی حیثیت اختیار کر چکا ہے، ضرورت ہے کہ اس رائے کا بھی قدرے سنجیدگی سے مطالعہ کیا جائے۔ علمی ذوق رکھنے والے حضرات اس کے مالہٗ وما علیہ پر بحث کریں اور اس سلسلے میں دونوں اطراف کے دلائل کا خالص علمی انداز میں تجزیہ کریں۔ سو ایسا ہوا بھی اور ایک سے زائد علماے کرام نے اس پر گراں قدر تنقیدات لکھیں اور اپنے موقف کو بہ حسن وخوبی بیان کیا۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر اس سلسلے میں چند امور کے بارے میں مزید وضاحت کر دی جائے تو صاحب رائے کی بات کو ٹھیک طرح سے سمجھنے اور اس کو قبول کرنے یا پھر اس پر تنقید کرنے کی راہ مزید آسان ہو سکتی ہے۔ باقی یہ بات تو سب پر واضح ہے کہ دینی معاملات میں اصل معیار کسی رائے کا قدیم یا جدید ہونا نہیں، بلکہ اُس کا صحیح اور غلط ہونا ہی ہے۔

اس بات پر جناب غامدی اور کم وبیش سب علما کا اتفاق ہے کہ اگر کوئی شخص اتمام حجت کے بعد حق بات کا انکار کر دے تو اسے کافر قرار دیا جا سکتا ہے، اس لیے کہ یہ اتمام حجت اور اس کے بعد کفر، اصل میں یہی تکفیر کے دو بنیادی شرائط ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ شرائط میں اس قدر اتفاق کے باوجود، اطلاق میں یہ جوہری فرق کیوں واقع ہو گیا ہے کہ علما تکفیر کے قائل اور کسی حد تک اس کے متمنی اور ان کے مقابلے میں غامدی صاحب اس پر شدید تنقید کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں؟ اس سوال کا جواب پانے اور یہ دیکھنے کے لیے کہ فریقین کا موقف اور ان کے دلائل کیا کچھ ہیں، ضروری ہے کہ اس بحث کو چند عنوانات کے تحت ذرا تفصیل سے دیکھ لیا جائے۔ جیسا کہ:

۱۔ اتمام حجت
۲۔ کفر
۳۔ تکفیر کے نتائج
۴۔ تکفیر کا جواز
۵۔ تکفیر کی ضرورت
۶۔ مسلم اور غیر مسلم

## اِتمام حجت

علماے قدیم ہوں یا جدید، یہ بات تقریباً سب کے ہاں طے شدہ ہے کہ کسی شخص کی تکفیر کے لیے پہلے اُس پر

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اتمام حجت کا ہو جانا ضروری ہے۔ غامدی صاحب بھی، جیسا کہ پیچھے بیان ہوا، اس بارے میں یہی رائے رکھتے ہیں۔ لیکن یہ اتمام حجت ہے کیا اور یہ کس طرح سے واقع ہوتا ہے، اس امر میں ان کے درمیان میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ علما کی عام طور پر رائے یہ ہے کہ مخاطب تک دین کی بات کا اِبلاغ کر دیا جائے تو اصل میں یہی اتمام حجت ہے۔ اب وہ مخاطب اُس بات کا انکار کر دے تو اُس کے اِس ظاہری انکار کی بنیاد پر بلا تردد اُس کی تکفیر کی جا سکتی ہے۔ غامدی صاحب کے نزدیک اتمام حجت صرف ابلاغ کا نام نہیں ہے۔ اُن کی رائے میں اول تو یہی ضروری ہے کہ مخاطب تک دین کی بات کا ابلاغ مکمل طور پر ہو چکا ہو، مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اُس پر اس بات کی تبیین بھی پوری طرح سے ہو چکی ہو۔ نیز، یہ تبیین اس قدر ہو کہ خدا کے سامنے پیش کرنے کے لیے اب اُس کے پاس کوئی عذر نہ رہ گیا ہو۔ یہ ابلاغ اور تبیین اپنی ذات میں کیا ہیں، اور غامدی صاحب کے ہاں یہ دونوں اتمام حجت کے لیے لازم کیوں ہیں، مزید یہ کہ یہ اتمام حجت کا ذریعہ کس طرح سے بنتے ہیں، ان تمام باتوں کی تفصیل ہم ذیل میں بیان کرتے ہیں:

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

## ۱۔ ابلاغ

اس سے مراد حق بات کا پہنچ جانا ہے۔ خدا کے ہاں اس چیز کو بڑی اہمیت حاصل ہے کہ حق بات لوگوں تک مکمل طور پر پہنچ چکی ہو۔ اس لیے کہ دین کے سارے تقاضے اُسی صورت میں جائز قرار پاتے ہیں کہ جب ان کے بارے میں پہلے سے آگاہ کر دیا گیا ہو۔ کسی بے خبر آدمی سے یہ تقاضا کرنا کہ وہ انھیں اپنے علم اور عمل میں لازماً اختیار کرے، نہایت ہی نامعقول اور ناروا بات ہے۔ چنانچہ خدائے برحق نے سب لوگوں تک حق بات کو پہنچانے کا پورا پورا انتظام کیا ہے۔ یہاں تک کہ وہ دنیا میں اپنے پیغمبروں کو بھیجتا ہے تو ابلاغ کے اس کام کو اُن کی بنیادی ذمہ داری قرار دیتا ہے۔ یہ لوگ اسے ادا کرتے ہیں یا نہیں، یہ جاننے کے لیے وہ اُن کے آگے اور پیچھے پہرے لگا دیتا ہے[1]۔ بلکہ اگر کوئی پیغمبر، بہ فرض محال، اس کام کو بھرپور طریقے سے انجام نہیں دیتا تو وہ اُس کے نزدیک گویا اپنے منصب کا حق ہی ادا نہیں کرتا[2]۔ غرض یہ کہ ہدایت کے ابلاغ کی یہی اہمیت ہے کہ پروردگار کی طرف سے اس کے لیے بنیادی طور پر دو طرح

---

[1] الجن ۷۲: ۲۸۔ ''وہ اُن کے آگے اور پیچھے پہرا لگا دیتا ہے تاکہ معلوم رہے کہ انھوں نے اپنے رب کے پیغامات پہنچا دیے ہیں، اور وہ اُن کے ماحول کو گھیرے میں اور اُن کی ہر چیز کو گنتی میں رکھتا ہے''۔

[2] المائدہ ۵: ۶۷۔ ''اے پیغمبر، جو کچھ تمھارے پروردگار کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے، وہ انھیں پہنچا دو اور (یاد رکھو کہ)

کے انتظامات کیے گئے ہیں: ایک داخلی اور دوسرے خارجی۔

## داخلی انتظام

یہ انسان کے باطن میں کیا گیا ہدایت کا انتظام ہے۔ یعنی، دین کے بارے میں کچھ بنیادی حقیقتیں اس کی فطرت ہی میں ودیعت کر دی گئی ہیں۔ مثال کے طور پر:

۱۔ خدا کی ربوبیت کا علم شروع دن سے اس کی فطرت کا حصہ بنا دیا گیا۔ اس لیے کہ دین کی پوری عمارت خدا ہی کے وجود پر قائم ہوتی اور اُس کا انکار درحقیقت دین کے بنیادی مقدمے کا انکار ہوتا ہے۔ مزید یہ کہ عالم ارواح میں تمام بنی آدم سے اس علم کا باقاعدہ اقرار بھی لیا گیا:

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى شَهِدْنَا. (الاعراف ۷: ۱۷۲)

''یاد کرو، جب تمھارے پروردگار نے بنی آدم کی پشتوں سے اُن کی نسل کو نکالا اور اُنھیں خود اُن کے اوپر گواہ ٹھیرایا تھا۔ اُس نے پوچھا تھا: کیا میں تمھارا رب نہیں ہوں؟ اُنھوں نے جواب دیا: ہاں، (آپ ہی ہمارے رب ہیں)، ہم اِس کی گواہی دیتے ہیں۔''

۲۔ اسے نیکی اور بدی میں امتیاز کرنے کی فطرت دے کر اس دنیا میں بھیجا گیا۔ نیکی کے لیے محبت اور اس کی طرف میلان اور بدی سے نفرت اور اس سے گریز کی صالح فطرت بھی اسے دے دی گئی۔ مقصد یہ تھا کہ اسے اخلاقیات کے معاملے میں ایک واضح ہدایت میسر آ سکے:

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا، فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰىهَا. (الشّمس ۹۱: ۷-۸)

''اور گواہی دیتا ہے نفس اور جیسا اُسے سنوارا، پھر اُس کی بدی اور نیکی اُسے سجھا دی۔''

## خارجی انتظام

جس طرح انسان کے باطن میں کچھ ہدایات رکھ دی گئیں، اسی طرح اس کے خارج میں بھی اس کا باقاعدہ اہتمام کیا گیا۔ مثال کے طور پر:

۱۔ حضرت آدم علیہ السلام کو یہ شرف عطا ہوا کہ اُنھوں نے براہ راست خدا کی بات سنی اور اس طرح خدا کے

---

اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اس کا پیغام نہیں پہنچایا''۔



www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ہونے کا یہ خارجی علم اس پہلے انسان کو ابتدا ہی میں حاصل ہو گیا۔ بعد ازاں یہ اُن کی اولاد میں بھی متوارث ہوتا چلا گیا اور ان سب کی ہدایت کا ایک عظیم ذریعہ بن گیا:

قَالَ يٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآءِ هِمْ. (البقرہ ۲: ۳۳)

''اللہ نے فرمایا: آدم اِن ہستیوں کے نام اِن فرشتوں کو بتاؤ۔''

۲۔ پروردگار نے بہت ساری نشانیاں آفاق میں رکھ چھوڑیں۔ یہ اپنے وجود سے اگر اپنے خالق کا تقاضا کرتی ہیں تو ان میں جھلکتی ہوئی اُس کی بے پناہ ربوبیت اور قدرت، یوم حساب کی ایک واضح دلیل ٹھیرتی ہیں:

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ. (البقرہ ۲: ۱۶۴)

''اس میں شبہ نہیں کہ آسمان اور زمین کے بنانے میں، اور شب و روز کے بدل کر آنے میں، اور لوگوں کے لیے دریا میں نفع کی چیزیں لے کر چلتی ہوئی کشتیوں میں، اور اس پانی میں جو اللہ نے آسمان سے اتارا ہے، پھر اس سے زمین کو اس کے مرجانے کے بعد زندہ کیا ہے اور اس میں ہر قسم کے جان دار پھیلائے ہیں ــــ اور ہواؤں کے پھیرنے میں، اور آسمان و زمین کے درمیان حکم کے تابع بادلوں میں، بہت سی نشانیاں ہیں ان کے لیے جو اپنی عقل سے کام لیتے ہیں۔''

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

۳۔ اُس نے مختلف زمانوں میں بہت سے انبیا کو مبعوث کیا جو اپنی ذات میں سراج منیر، یعنی ہدایت کے روشن مینار رہوئے۔ انھوں نے اُس کی دی ہوئی سند کے ساتھ لوگوں کو ہدایت دی اور فطرت اور آفاق میں موجود حقائق کی بے مثل تذکیر کی اور ان کی تفصیلات کو اس قدر کھول کر بیان کیا کہ اس سے زیادہ وضاحت کا تصور کرنا بھی محال ہے:

وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا. (الانبیاء ۲۱: ۷۳)

''اور ہم نے اُن کو امامت عطا فرمائی کہ ہماری ہدایت کے مطابق (دنیاوالوں کی) رہنمائی کرتے تھے۔''

۴۔ اس کے ساتھ بہت سے نبیوں کو رسول بنا کر بھی بھیجا جنھوں نے دوسرے انبیا کی طرح آخرت کے بارے میں انذار کیا اور اچھے انجام کی خوش خبری سنائی۔ ان کے مقابلے میں جب انکار اور تکذیب کی روش اپنائی گئی تو مزید یہ ہوا کہ پروردگار عالم کی عدالت پوری شان سے اس زمین پر برپا ہوگئی اور یوں رہتی دنیا تک کے لوگوں کے لیے آسمانی عدالت کی ایک محسوس دلیل قرار پائی:

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ فَاِذَا جَآءَ رَسُوْلُهُمْ قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ. (یونس ۱۰: ۴۷)

''ہر قوم کے لیے ایک رسول ہے۔ پھر جب اُن کا رسول آ جاتا ہے تو اُن کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیا جاتا ہے اور اُن پر کوئی ظلم نہیں کیا جاتا۔''

۵۔ ان نبیوں اور رسولوں کے ساتھ خدا نے بہت سی کتابیں اور صحیفے بھی اُتارے۔ یہ حق و باطل کا معیار قرار پائے اور ان کے ہوتے ہوئے اس معاملے میں ہدایت کے کسی اور انتظام کی ضرورت نہ رہ گئی:

وَ اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ. (البقرہ ۲: ۲۱۳)

''اور اللہ نے ان نبیوں کے ساتھ قول فیصل کی صورت میں اپنی کتاب نازل کی تاکہ لوگوں کے درمیان وہ اُن کے اختلافات کا فیصلہ کر دے''

پروردگار کی طرف سے کیے گئے یہ ہدایت کے داخلی اور خارجی انتظامات ہیں۔ ان کے بارے میں واضح رہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے سے غیر متعلق اور اپنی ذات میں مستقل اور بے نیاز نہیں ہیں، بلکہ ان کے درمیان میں ایک طرح کا لزوم اور ایک دوسرے پر مکمل انحصار پایا جاتا ہے۔ انسان کا اندرون جس بات کو محسوس کرتا ہے، اُس کے بیرون میں پائی جانے والی ہدایت ہی اصل میں اس کا اولین محرک ہوتی ہے اور جب یہ باطنی احساس شدید تر ہو جائے تو یہی اس پر اپنی مہر تصدیق بھی ثبت کرتی ہے۔ دوسری طرف سے دیکھا جائے تو اس کے بیرون میں موجود ہدایت اُس وقت تک نتیجہ خیز نہیں ہو سکتی جب تک کہ اندرون میں پائی جانے والی ہدایت اس کی تائید نہ کرتی ہو۔ یہ داخلی اور خارجی انتظامات اسی طرح ایک دوسرے کی تائید اور باہمی موافقت سے ابلاغ کے کام کو سرانجام دیتے اور یوں اتمام حجت کے پہلے جز کو آخری درجے میں پورا کر دیتے ہیں۔

یہاں ایک بات واضح رہنی چاہیے کہ جس سے ناواقفیت اس باب میں اکثر لوگوں کے ہاں علمی مغالطوں کا سبب بن جاتی ہے۔ وہ یہ کہ اس ہدایت کا انسان کے اندر اور اُس کے گرد و پیش میں موجود ہونا، یہ ابلاغ نہیں ہے، اس لیے کہ یہ سب انتظامات اپنی اصل میں ہدایت کے محض ذرائع ہیں۔ اس سے آگے بڑھ کر، اس ہدایت کا کانوں میں پڑ جانا یا اس کے آثار کا نگاہوں کے سامنے آ جانا، یہ بھی ابلاغ نہیں ہے، اس لیے کہ یہ سماعت و بصارت بھی اسے دل و دماغ تک پہنچانے کے بس ذریعے ہی ہیں۔ ابلاغ یہ ہے کہ ہدایت ان ذرائع سے کسی شخص تک اس طرح پہنچ جائے کہ ہم بلا تردد اُس کے بارے میں یہ کہہ سکیں کہ وہ اسے ''جانتا'' ہے۔ ہم بارہا دیکھتے ہیں کہ کسی شخص کے داخل میں دوسرے انسانوں کی طرح فطری ہدایت موجود ہوتی ہے اور وہ خارج سے اس کی بصارت اور اس کی سماعتوں سے بھی

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ٹکرا رہی ہوتی ہے، مگر وہ اس کے علم اور شعور تک بالکل نہیں پہنچ پاتی، اس لیے کہ وہ مثال کے طور پر، مجنون اور دیوانہ ہوتا ہے۔ یا دوسری صورت میں وہ دانا اور بینا تو ہوتا ہے اور اُس کے خارج میں خدا کی اتاری ہوئی کتابیں اور اس کے بھیجے ہوئے پیغمبر بھی موجود ہوتے ہیں، مگر کسی قدرتی اور واقعی حجاب کی وجہ سے اُس تک ان چیزوں کا ابلاغ ہی نہیں ہو پاتا کہ ہم اس کے بارے میں بھی یہ کہہ سکیں کہ وہ ان باتوں کو 'جانتا' ہے[۳]۔

# ۲۔ تبیین

اس سے مراد حق بات کا واضح ہو جانا ہے۔ تبیین کا یہ عمل کہ جسے دوسرے لفظوں میں وضوح بھی کہا جا سکتا ہے، اتمام حجت کا دوسرا لازمی جز ہے۔ کسی شخص پر اتمام حجت کے لیے ضروری ہے کہ اُس تک حق بات کا نہ صرف یہ کہ ابلاغ ہو چکا ہو، بلکہ وہ آخری درجے میں اس پر واضح بھی ہو چکی ہو۔ یہ وضوح دو چیزوں میں ہوتا ہے: ایک اُس بات کے مطلب اور مفہوم میں اور دوسرے اس کے حق اور سچ ہونے میں۔ اگر وہ شخص اُس بات کو ابھی تک سمجھا ہی نہیں یا وہ بات حق ہے اور اس کے مقابلے میں باقی سب کچھ باطل، یہ بات نہیں سمجھ سکا تو اس کا مطلب یہی ہے کہ اس پر وضوح کا ہونا ابھی باقی ہے۔ یہ اس لیے ضروری ہے کہ انسان دنیا میں ہونے والے امتحان میں اپنے علم اور سمجھ کی بنیاد پر مسئول ٹھیرایا گیا ہے۔ چنانچہ جب تک وہ کسی چیز کو اچھی طرح سے سمجھ نہ لے، اس سے کوئی باز پرس ہرگز نہیں ہونی چاہیے۔ خدا کی صفت عدل بھی اس طرح کے ظلم سے شدید اِبا کرتی ہے کہ وہ کسی شخص کو علم دیے بغیر اُس کا مواخذہ کرے یا وہ بات کو ابھی سمجھ نہ پایا ہو اور وہ پھر بھی اُس کو سزا دے ڈالے۔ اتمام حجت کے ذیل میں اس کی یہی حیثیت ہے کہ خدا نے اس کا بہت زیادہ اہتمام کیا ہے۔ مثال کے طور پر:

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

ا۔ وہ اپنے پیغمبروں کو جس طرح ہدایت پہنچانے کا ذمہ دار ٹھیراتا ہے، اسی طرح ان سے یہ تقاضا بھی کرتا ہے کہ وہ اس کے متعلق ہر چیز لوگوں کے سامنے کھول کھول کر بیان کر دیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا ہے:

وَاَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡکَ الذِّکۡرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیۡہِمۡ. (النحل ۱۶: ۴۴)

''اور یہ یاددہانی ہم نے تمھاری طرف اتاری ہے، اس لیے کہ تم اِن لوگوں کے لیے اُس چیز کو کھول کر

---

۳؎ ایسا ہو جانا، اس دنیا میں معمول کی بات ہے۔ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے منکرین پر عذاب کا فیصلہ ہونے جا رہا تھا تو اس مرحلے پر بھی فرمایا گیا کہ ان میں سے جو کوئی پناہ کا طالب ہو، اُسے پناہ دے کر اللہ کی بات سنائی جائے، اس لیے کہ یہ اُس قوم کے افراد ہیں جو دین اور نبوت سے زیادہ واقف نہیں (التوبہ ۹: ۶)۔

بیان کر دو جو اِن کی طرف نازل کی گئی ہے۔''

۲۔ دعوت کے دوران میں لوگ سوال اٹھاتے ہیں تو پروردگار عالم خود ان کے جوابات دیتا اور ہر طرح کے دلائل سے اپنی بات کو واضح کرتا ہے:

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ. (البقرہ ۲: ۱۸۷) ''اللہ اسی طرح اپنی آیتیں لوگوں کے لیے واضح کرتا ہے تاکہ وہ تقویٰ اختیار کریں۔''

۳۔ اس کی طرف سے نازل ہونے والی کتابیں بھی اسی تبیین و وضاحت کی حامل ہوتی ہیں۔ چنانچہ آخری کتاب کا تعارف اس نے کئی جگہ کتاب مبین کے الفاظ سے کرایا بھی ہے:

الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ. (یوسف ۱۲: ۱) ''یہ سورۂ 'الٓر' ہے۔ یہ اُس کتاب کی آیتیں ہیں جو اپنا مدعا پوری وضاحت کے ساتھ بیان کرتی ہے۔''

۴۔ یہاں تک کہ وہ اسی مقصد کے پیش نظر کسی دوسری زبان میں نہیں، بلکہ لوگوں پر اُنھی کی زبان میں اپنا کلام نازل کرتا ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ. (ابراہیم ۱۴: ۴) ''ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے، اُس کی قوم کی زبان میں بھیجا ہے، اس لیے کہ وہ اُنھیں اچھی طرح کھول کر سمجھا دے۔''

۵۔ بلکہ وہ ہدایت کا ابلاغ ہو جانے کے فوری بعد اگر لوگوں کی پکڑ نہیں کرتا اور انھیں ایک خاص مدت تک کے لیے مہلت دیتا ہے تو اس کی ایک وجہ یہی ہوتی ہے کہ وہ اسے اچھی طرح سے سمجھ لیں۔ یہ مہلت حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کو تقریباً ساڑھے نو سو سال تک دی گئی:

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَلَبِثَ فِيْهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا خَمْسِيْنَ عَامًا. (العنکبوت ۲۹: ۱۴) ''ہم نے نوح کو اُس کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا تو وہ پچاس کم ایک ہزار سال اُن لوگوں میں رہا۔''

یہ سب ہدایت کی تبیین اور اُس کی وضاحت کے لیے کیا گیا اہتمام ہے۔ اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے انسان کو کچھ مخصوص صلاحیتوں، یعنی سماعت و بصارت اور عقل و فکر سے بھی نوازا گیا ہے[۴]۔ ان صلاحیتوں کا فقدان یا ان میں

---

[۴] ان صلاحیتوں کا یہ واجبی حق بھی ہے کہ ہدایت کو پانے کے لیے انھیں لازماً استعمال میں لایا جائے کہ ایسا نہ کرنا حقیقت میں ان کی ناقدری کرنا ہے (المومنون ۲۳: ۷۸)۔



www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

کوئی واقعی نقص نہ پایا جاتا ہو اور آدمی نفسانی عوارض سے اپنے آپ کو بچا کر رکھے تو دین کی ہدایت جو اپنی حقیقت اور اپنے بیان میں انتہا درجے کی سادگی لیے ہوئے ہے، اس کے سامنے بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ البتہ، یہ بات بھی صحیح ہے کہ ہر ایک کے لیے ہدایت کے مواقع اور اسے اخذ کرنے والی صلاحیتیں چونکہ ایک جیسی نہیں ہوتیں، اس لیے تبیین کا یہ عمل بھی ہر کسی کے لیے ایک جیسا نہیں ہوتا۔

## خلاصۂ بحث

خلاصہ یہ ہے کہ تکفیر کے لیے جس اتمام حجت کی ضرورت ہے، وہ اپنی حقیقت میں دو چیزوں سے مرکب ہے: ایک ابلاغ اور دوسرے تبیین۔ علماے کرام جن جن دلائل کی بنیاد پر ابلاغ کو لازم قرار دیتے ہیں، کم و بیش وہی دلائل اتمام حجت کے دوسرے جز، یعنی تبیین کے حق میں بھی موجود ہیں۔ اگر ابلاغ کا ہونا عقل و فطرت کا تقاضا ہے اور اس دنیا میں برپا ہمارے امتحان کا ایک لازمہ ہے تو اس کی تبیین بھی انھی اصولوں پر واجب ٹھیرتی ہے۔ ابلاغ کے لیے خدا نے بہت سے انتظامات کیے ہیں تو اس کی وضاحت کے لیے بھی کچھ کم انتظام نہیں کیا اور ان دونوں کے بارے میں یہ خصوصی اہتمام خود اس بات کی دلیل ہے کہ یہ دونوں ہی اصل میں مقصود ہیں کہ یہ سب اُس ذات کی طرف سے ہوا ہے جو کسی بھی طرح کی بے مقصدیت سے بالکل پاک ہے۔ سو کوئی وجہ نہیں ہے کہ تکفیر کے عمل میں ان دونوں میں سے ایک کو شرط کے طور پر قبول کیا جائے اور دوسرے سے مطلق صرف نظر کر لیا جائے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

# کفر

'کفر' عربی زبان کا ایک لفظ ہے اور کئی مفاہیم کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ علما کے ہاں تکفیر کی بحث میں عام طور پر اس کے ایک سے زائد مفاہیم کا لحاظ رکھا جاتا اور ان تمام معنوں میں اس کا ارتکاب کرنے والوں کو کافر قرار دے دیا جاتا ہے۔ ان کے مقابلے میں غامدی صاحب اس کے ایک خاص معنی کو سامنے رکھتے ہیں۔ وہ یہ کہ کوئی شخص اِتمام حجت کے بعد حق بات کا انکار کر دے۔ یعنی، بات اُس تک پہنچ جائے اور آخری درجے میں اُس پر واضح بھی ہو جائے اور وہ پھر بھی اسے مان لینے سے انکاری رہے۔ اُن کے نزدیک یہ اِنکار ہی اصل میں وہ کفر ہے کہ جس کی بنیاد پر کوئی شخص

بلکہ یہی وہ صلاحیتیں ہیں کہ جن کی وجہ سے انسان جانوروں سے الگ ایک نوع قرار پاتا اور اگر ان سے فائدہ نہ اٹھائے تو اُنھی کا ایک فرد ہو کر رہ جاتا ہے (الانفال ۸: ۲۲)۔

کافر قرار پاتا ہے۔ نیز، وہ یہ شرط بھی لگاتے ہیں کہ اس انکار کے پیچھے ضد اور ہٹ دھرمی کے سوا کچھ نہ ہو، اس لیے کہ کسی معقول عذر کی بنیاد پر کیا جانے والا انکار اگرچہ صریح ہو، پھر بھی 'کفر' نہیں ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو اُن کے ہاں اتمام حجت کے بعد محض انکار نہیں، اِس طرح کا انکار ہے جو تکفیر کی دوسری لازمی شرط قرار پاتا ہے۔ اُن کی اِس بات کی وضاحت ہم دو عنوانات کے تحت دیکھ سکتے ہیں: ایک کفر کا مطلب اور دوسرے اعذار۔

## ۱۔ کفر کا مطلب

'کفر' کا اصل مطلب چھپانا ہے۔ یہیں سے اس کے اندر کسی چیز کی ناشکری اور اُس کے انکار کا معنی پیدا ہوا۔ ہر زبان میں یہ ہوتا ہے کہ الفاظ اپنا معنی اپنے مقابل کی رعایت سے متعین کرتے ہیں، چنانچہ 'کفر' کا لفظ بھی جب شکر کے مقابلے میں آئے تو ہم جان لیتے ہیں کہ اس کا مطلب ناشکری ہے[۵]۔ اسی طرح جب یہ ایمان کے مقابلے میں آئے تو اس کا مطلب نہ ماننا اور انکار کر دینا ہوتا ہے۔ سر دست ہماری ساری بحث 'کفر' کے اس دوسرے معنی تک محدود ہے۔ اس معنی میں اسے قرآن نے بہت سارے مقامات پر استعمال کیا ہے۔ ان تمام مقامات کا اگر دقت نظر سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوجاتا ہے کہ اس کے پیش نظر تین طرح کے مفاہیم کو ادا کرنا ہے:

اول، اس کے لغوی مفہوم کو ادا کرنا۔ جیسا کہ بیان ہوا ہے:

اِنِّیْ کَفَرْتُ بِمَآ اَشْرَکْتُمُوْنِ مِنْ قَبْلُ. (ابراہیم ۱۴:۲۲) ''تم نے جو مجھے شریک ٹھیرایا تھا، میں نے اُس کا پہلے ہی انکار کر دیا ہے۔''

یعنی، میں اس بات کو ماننے سے انکار کرتا ہوں۔

دوم، اس لفظ کو عام لغوی معنی سے اوپر اُٹھا کر اس سے ایک خاص طرح کا مذہبی مفہوم ادا کرنا۔ جیسا کہ ارشاد ہوا ہے:

لَقَدْ کَفَرَ الَّذِیْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰہَ ھُوَ الْمَسِیْحُ ابْنُ مَرْیَمَ. (المائدہ ۵:۷۲) ''اُن لوگوں نے بھی یقیناً کفر کیا ہے جنھوں نے کہا کہ خدا تو یہی مسیح ابن مریم ہے۔''

یعنی، انھوں نے یہ شرک کر کے ایک مذہبی حقیقت کو ماننے سے انکار کر دیا ہے۔

سوئم، اسے مذہب کی ایک باقاعدہ اصطلاح بنا کر استعمال کرنا۔ اب اس کا مطلب محض کسی دینی حقیقت کا انکار کر دینا نہیں، بلکہ دین کی کسی بات کے واضح ہو جانے کے بعد جان بوجھ کر اس کا انکار کر دینا ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر

---

۵؎ جیسا کہ اس آیت میں: 'وَاشْکُرُوْا لِیْ وَ لَا تَکْفُرُوْنِ' (البقرہ ۲:۱۵۲)۔

فرمایا ہے:

كَيْفَ يَهْدِى اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ وَشَهِدُوْٓا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّجَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ. (آل عمران ۳: ۸۶)

''اللہ اُن لوگوں کو ہدایت کس طرح دے گا جو ماننے کے بعد منکر ہو گئے، دراں حالیکہ وہ اس بات کے گواہ ہیں کہ یہ رسول سچے ہیں اور (ان کی سچائی پر گواہی کے لیے) اُن کے پاس کھلی ہوئی نشانیاں بھی آ چکی ہیں۔''

یعنی، اُنھوں نے دل سے مان کر پھر جان بوجھتے ہوئے انکار کر دیا۔

لفظِ 'کفر' کے ان تینوں استعمالات کو جان لینے کے بعد بہ خوبی واضح ہو جاتا ہے کہ پہلے دو معنوں میں کسی شخص کو کافر کہہ دینا، اصل میں اس لفظ کا فقط لغوی استعمال ہے۔ اس طرح کے استعمال کو یہ کہتے ہوئے جائز قرار دیا جاتا ہے کہ ہم کسی فعل کو ادا کرنے والے شخص کو عام بول چال میں اُس کا فاعل ہی کہتے ہیں، جیسے مارنے والے کو 'ضَرَبَ' کی مناسبت سے 'ضَارِب' کہہ دیا جائے۔ لیکن اس معاملے میں واضح رہے کہ یہاں فاعل کے اصول پر کسی کو کافر کہہ دینا ہرگز جائز نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب کوئی لفظ باقاعدہ اصطلاح بن جائے تو اُسے بغیر کسی قرینے[۶] کے اُس کے اصطلاحی مفہوم سے ہٹ کر دوسرے مفاہیم میں استعمال کرنا اب ممکن نہیں رہتا۔ مثال کے طور پر، ہم 'مسلم' کی اصطلاح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والوں کے لیے بولتے ہیں۔ اسے اطاعت گزار یا کسی بھی دینی حقیقت کا اقرار کرنے والوں کے لیے اب ہرگز نہیں بولا جا سکتا، الّا یہ کہ کسی قرینے سے اس کی وضاحت کر دی جائے۔ اسی طرح کا معاملہ لفظ 'بدعت' اور اس کے فاعل کا بھی ہے۔ اصطلاح بن جانے کے بعد اب ہر وہ شخص جو کسی بھی طرح کے نت نئے کام کرتا ہو، اُسے بھی محض فاعل کے قیاسی اصول پر ہم بدعتی نہیں کہہ سکتے۔ تاہم، اس کے باوجود اگر کوئی شخص اول الذکر دو معنوں میں اس کا ارتکاب کرنے والوں کے لیے کافر ہی کے لفظ پر اصرار کرے تو یہ اپنے منہ سے بس ایک بات کہہ دینا ہے، اس سے زیادہ اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ البتہ، جب تیسرے معنی میں کسی کو کافر کہا جاتا ہے تو اس کے بارے میں اول تو یہ بات واضح رہے کہ اصل میں یہی تکفیر ہے جو اپنے ساتھ بہت سے مقدمات اور نتائج لیے ہوئے ہے، اور اسی کے جواز میں غامدی صاحب دیگر علماے کرام سے اختلاف کرتے ہیں۔

---

۶۔ جیسا کہ اس آیت میں 'کافر' چونکہ اصطلاحی معنی میں نہیں ہے، اس لیے 'ملاقات' کا قرینہ بھی اس کے ساتھ لایا گیا ہے: 'وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ بِلِقَآئِ رَبِّهِمْ لَكٰفِرُوْنَ'، ''بے شک، لوگوں میں بہت سے ہیں جو اپنے پروردگار سے ملاقات کے منکر ہیں'' (الروم ۳۰: ۸)۔

دوم یہ کہ قرآن جب کسی شخص کی تکفیر کرتا ہے تو وہ لفظِ 'کفر' کو اسی تیسرے معنی میں استعمال کر رہا ہوتا ہے۔ ذیل کی یہ آیت ان دونوں باتوں کی صریح دلیل ہے:

فَلَمَّا جَآءَ هُمۡ مَّا عَرَفُوۡا كَفَرُوۡا بِهٖ فَلَعۡنَةُ اللّٰهِ عَلَى الۡكٰفِرِيۡنَ. (البقرہ ۲: ۸۹)

''پھر جب وہ چیز ان کے پاس آئی جسے خوب پہچانے ہوئے تھے تو یہ اُس کے منکر ہو گئے۔ سو اللہ کی لعنت ہے اِن کافروں پر۔''

## ۲۔ اعذار

یہ علم و عقل اور اخلاق سے متعلق ہر نظام میں بنیادی مسلمات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان نہ تو کسی قادرِ مطلق ہستی کا نام ہے اور نہ ہر وقت اُس کی طبیعت اور حالات ہی ایک جیسے ہوتے ہیں کہ تعمیل حکم میں اُس کے سارے افراد سے ایک جیسا تقاضا کیا جائے۔ دین اسلام کی بھی ہر بات میں، وہ عقیدے کی ہو یا عمل کی، ان اعذار کو مرکزی حیثیت دی جاتی ہے[۷]۔ دیگر علما کے مقابلے میں غامدی صاحب کا معاملہ یہ ہے کہ وہ ان کی اِس حیثیت کا مسئلہ تکفیر میں بھی پورا پورا لحاظ رکھتے اور اِس بنیاد پر ہر شخص و ناکس کو رعایت دینا ضروری سمجھتے ہیں۔ اُن کے نزدیک اگر کوئی شخص حقیقی اور اصطلاحی معنی میں کفر کرے تو اس سے بھی یہ لازم نہیں آتا کہ اُس کی تکفیر ضرور ہی کر دی جائے۔ اس لیے کہ اس بات کا امکان کبھی رد نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اس کفر میں اپنے پاس کوئی عذر رکھتا ہو جو خدا کے ہاں قابل مسموع اور قابل التفات ٹھیرے۔ یہ اعذار بہت سے ہو سکتے ہیں اور حق بات کو سمجھنے، اُس کا اقرار یا اُس پر عمل کرنے کے دوران میں کسی بھی وقت لاحق ہو سکتے ہیں، ہم ان میں سے چند ایک کو ذیل میں بیان کیے دیتے ہیں:

### ۱۔ عدم استطاعت

ہر بات مخاطب کی استطاعت کے مطابق اُس پر لازم کی جاتی ہے، اس لیے کہ یہی عدل اور یہی انصاف ہے۔

---

[۷] ان اعذار کے بارے میں یہ بات بھی جان لینی چاہیے کہ یہ کہیں باہر سے آ کر حکم میں شامل نہیں ہوتے، بلکہ ایک عقلی اقتضا کے طور پر اُس کی ابتدا ہی سے اس کے ساتھ جڑے ہوتے ہیں۔ لہٰذا ضروری نہیں ہوتا کہ انھیں ہر حکم کے ساتھ الگ سے بیان بھی کیا جائے۔

کسی لنگڑے شخص سے بھاگنے اور کسی اندھے شخص سے دیکھنے کا مطالبہ کرنا، تکلیف مالایطاق ہے جو صریح طور پر ناروا اور ایک ناجائز امر ہے۔ دین کی بھی ہر بات میں مخاطب کی استطاعت کی رعایت ہوتی ہے۔ جس شخص میں یہ استطاعت موجود نہ ہو، وہ کسی بات کا مکلّف ہی نہیں رہتا کہ خدا اس بارے میں اُس سے کوئی جواب دہی کرے۔ ارشاد ہوا ہے:

لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا. (البقرہ۲:۲۸۶) ''اللہ کسی پر اُس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔''

## ۲۔ خطا

غلطیوں سے درگذر کرنا عین رحمت ہے۔ والدین بچے کی غلطیوں سے اعراض کرتے ہیں جو اُن کی محبت اور شفقت کی دلیل ہوتا ہے۔ خدا بھی بڑا مہربان ہے اور اُس کی رحمت اُس کے غضب سے آگے بڑھ گئی ہے۔ وہ اپنے بندوں کی غلطیوں پر کبھی اُن کا مواخذہ نہیں کرتا۔ اُس کے ہاں بس وہی گناہ قابل گرفت ہیں جو غلطی اور اتفاق سے نہیں، دل کے ارادے اور تعمد کے نتیجے میں واقع ہوں۔ فرمایا ہے:

وَلَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ فِیْمَآ اَخْطَاْتُمْ بِہٖ وَلٰکِنْ مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوْبُکُمْ وَکَانَ اللّٰہُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا. (الاحزاب۳۳:۵) ''تم سے جو غلطی اِس معاملے میں ہوئی ہے، اُس کے لیے تم پر کوئی گرفت نہیں، لیکن تمھارے دلوں نے جس بات کا ارادہ کر لیا، (اُس پر ضرور گرفت ہے)۔ اور اللہ بخشنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔''

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

## ۳۔ جبر و اکراہ

کسی شخص کو اُس کام پر جواب دہ ٹھیرانا جو اس نے کسی جبر اور اِکراہ کے تحت کیا ہو، صریح ظلم اور حد درجے کی زیادتی ہے۔ اللہ کی ذات اس طرح کے ہر ظلم سے پاک ہے۔ اُس کے ہاں پرسش اس عمل کی ہوتی ہے جو کسی مجبوری سے نہیں، بلکہ آزادانہ مرضی سے کیا گیا ہو۔ سو اس نے بتا دیا ہے کہ اگر دل میں ایمان موجود ہو اور کسی مجبوری کے باعث کفر کرنا پڑے تو اس پر کوئی مواخذہ نہیں ہے:

مَنْ کَفَرَ بِاللّٰہِ مِنْۢ بَعْدِ اِیْمَانِہٖٓ اِلَّا مَنْ اُکْرِہَ وَقَلْبُہٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِیْمَانِ وَلٰکِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْکُفْرِ صَدْرًا فَعَلَیْھِمْ غَضَبٌ مِّنَ ''جو اپنے ایمان لانے کے بعد اللہ سے کفر کریں گے، اُنھیں اگر مجبور کیا گیا ہو اور اُن کا دل ایمان پر مطمئن ہو، (تب تو کچھ مواخذہ نہیں)، مگر جو کفر کے لیے

اللّٰہِ وَلَھُمۡ عَذَابٌ عَظِیۡمٌ. (النحل ۱۶:۱۰۶) سینہ کھول دیں گے، اُن پر اللہ کا غضب ہے اور انھیں بڑی سخت سزا ہوگی۔''

## خلاصۂ بحث

غامدی صاحب کی راے کے مطابق کفر اپنے ہر معنی میں تکفیر کا موجب نہیں ہے، جیسا کہ علما کا عمومی رجحان ہے۔ کسی شخص کا اِتمام حجت کے بعد جانتے بوجھتے ہوئے دین کی بات کا انکار کر دینا، اصل میں یہی وہ کفر ہے جو تکفیر کی بحث سے متعلق ہے۔ وہ اس پر یہ شرط بھی لگاتے ہیں کہ اس کفر کا ارتکاب کرنے والے کے پاس اس معاملے میں کوئی عذر بھی نہ ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ عین ممکن ہے کہ اُس شخص میں ہدایت کو اخذ کرنے والی صلاحیتیں بالکل معدوم ہوں یا اُن میں کوئی واقعی خلل پایا جاتا ہو یا اُس کے ماحول میں وہ تحریک ہی موجود نہ ہو کہ ہدایت اُس کے علم و شعور تک رسائی پا سکے۔ اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ وہ دل و جان سے ہدایت کو پانے کی جستجو کرے، مگر اس میں کسی سنگین غلطی کا ارتکاب کرے، حتیٰ کہ صریح کفر کا اظہار اور اُس کا اقرار کر بیٹھے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ حق بات کو جان تو لے، مگر کسی جبر کے مانع ہو جانے کی وجہ سے اُس کا انکار کر دے۔ اب ظاہر ہے کہ اس طرح کی تمام صورتوں میں وہ عدم استطاعت، خطا اور جبر و اکراہ کی وجہ سے جواب دہ ہی نہیں رہ جاتا، چہ جائیکہ کوئی اُس کی تکفیر کر دے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

# کفر کے نتائج

کسی شخص کی تکفیر کر دینا، یہ محض اُسے برا بھلا کہہ دینا نہیں، بلکہ یہ اپنی ذات میں ایک نہایت پیچیدہ امر ہے۔ جس طرح تکفیر کے کچھ مقدمات ہیں، جیسا کہ تفصیل گزری، اسی طرح دنیا اور آخرت میں مرتب ہونے والے اس کے کچھ سنگین نتائج بھی ہیں۔ ان نتائج کو ماننا ہر اُس شخص کے لیے ضروری ہے جو تکفیر کا ارادہ کرے۔ عام طور پر دوسروں کی تکفیر تو کر دی جاتی ہے، مگر اس کے تمام نتیجوں کو نہ خود قبول کیا جاتا ہے اور نہ بعض مصلحتوں کے پیش نظر دوسروں کے سامنے اُن کے واقع ہو جانے کا اظہار ہی کیا جاتا ہے۔ غامدی صاحب کے ہاں تکفیر چونکہ مجرد حالت میں نہیں، بلکہ اپنے تمام نتیجوں سمیت زیر بحث آتی ہے، اس لیے وہ ہر اُس شخص کے اوپر، جسے کافر قرار دے دیا گیا ہو، اُن کے اطلاق کو قبول کرتے اور اس کا مطالبہ بھی کرتے ہیں۔ ذیل میں ہم تکفیر کے چند نتائج کا ذکر کرتے ہیں کہ جنھیں تسلیم

کرنا، مکفرین کے لیے بہرصورت لازم ہے:

## ۱۔ لعنت

'لعنت' کا لفظ رحمت کے مقابلے میں استعمال ہوتا ہے۔ جب کوئی شخص جان بوجھ کر حق بات کا انکار کر دے اور اس کے بعد توبہ و استغفار کرنے کے بجاے اس پر اصرار کیا کرے تو وہ خدا کے ہاں ملعون قرار پاتا اور اُس کی رحمت سے بہت دور ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ وقت آتا ہے کہ فرشتے اور سب انسان، خدا کے اس فیصلے کی تائید میں اُس پر لعنت کی بددعائیں کرتے ہیں۔ لہٰذا، جو شخص دوسروں کی تکفیر کرتا ہے، اُسے یہ بات ضرور ماننی چاہیے کہ اب وہ اُن 'کافروں' کے لیے نہ کبھی ہدایت کی دعا کرے گا اور نہ کبھی خدا سے اُن کے لیے رحمت ہی طلب کرے گا:

فَلَمَّا جَآءَ هُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ. (البقرہ ۲: ۸۹)

''پھر جب وہ چیز ان کے پاس آئی جسے خوب پہچانے ہوئے تھے تو یہ اُس کے منکر ہو گئے۔ سو اللہ کی لعنت ہے ان کافروں پر۔''

كَيْفَ يَهْدِى اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ وَشَهِدُوْٓا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّجَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ. اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ اَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ. (آل عمران ۳: ۸۶-۸۷)

''اللہ اُن لوگوں کو ہدایت کس طرح دے گا جو ماننے کے بعد منکر ہو گئے، دراں حالیکہ وہ اس بات کے گواہ ہیں کہ یہ رسول سچے ہیں اور (ان کی سچائی پر گواہی کے لیے) اُن کے پاس کھلی ہوئی نشانیاں بھی آ چکی ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ اِس طرح کے ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔ یہی ہیں کہ جن کی سزا یہ ہے کہ ان پر اللہ اور اُس کے فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت ہے۔''

## ۲۔ ختم قلوب

سمع و بصر کی صلاحیتیں اور ہمارے دلوں کی حیات، یہ سب خدا کی رحمت کے مرہون منت ہیں۔ جن لوگوں پر اُن کے مسلسل انکار کی وجہ سے اُس کی طرف سے لعنت کر دی جاتی ہے، اُن کی یہ صلاحیتیں کند اور اُن کے دل مکمل طور پر زنگ آلود ہو جاتے ہیں۔ ایک وقت آتا ہے کہ ہدایت کے ان ذرائع کی یہ حالت ہو جاتی ہے گویا کسی نے اُنھیں مہر بند کر دیا ہو۔ کفر کے اس نتیجے کو اِصطلاح میں 'ختم قلوب' کہتے ہیں[۸]۔ یہ صورت حال اس بات کا اعلان ہوتی ہے کہ اُنھیں

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

لاکھ سمجھایا جائے، وہ ہرگز ایمان نہ لائیں گے اور لازم ہے کہ اُن کی موت اسی کفر کے اوپر واقع ہو۔ چنانچہ جو شخص دوسروں کی تکفیر کرتا ہے، اُسے چاہیے کہ وہ اُن کی ہدایت کے اِمکان کو اب مکمل طور پر رد کرے اور دوسرے یہ کہ اُنھیں ہدایت کی امید میں کبھی دین کی دعوت نہ دے کہ اُن کی موت لازماً کفر پر ہونے کی وجہ سے یہ ایک عبث کا کام ہوگا:

فَمَا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا بِمَا كَذَّبُوا مِنْ قَبْلُ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الْكٰفِرِيْنَ. (الاعراف ۷:۱۰۱)

''سو، ایسا نہیں ہوا کہ یہ ایمان لاتے، اِس لیے کہ پہلے جھٹلاتے رہے تھے۔ اللہ کافروں کے دلوں پر اسی طرح مہر لگا دیتا ہے۔''

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ. خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ. (البقرہ ۲:۶-۷)

''جن لوگوں نے کفر کا فیصلہ کر لیا ہے، اُن کے لیے برابر ہے، تم اُنھیں خبردار کرو یا نہ کرو، وہ نہ مانیں گے۔ اُن کے دلوں اور کانوں پر اب اللہ نے مہر لگا دی ہے اور اُن کی آنکھوں پر پردہ ہے۔''

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

## ۳۔ ابدی جہنم

جو لوگ اللہ سے بے پروا ہوں یا اُس کے سامنے سرکشی اختیار کریں، اُنھیں وہ ابدی جہنم کی وعید سناتا ہے۔ جو شخص جانتے بوجھتے ہوئے کفر کرتا ہے، وہ اصل میں بے پروائی اور سرکشی ہی کا جرم کرتا ہے، چنانچہ وہ آخرت میں ابدی جہنم کی سزا کا مستحق ٹھیرایا جاتا ہے جس میں کوئی کمی ہوگی اور نہ ذرا سی دیر کے لیے اُسے دم لینے کی مہلت ہی ملے گی۔ سو جو شخص دوسروں کی تکفیر کرتا ہے، اُسے یہ بھی ماننا چاہیے کہ اُن ''کافروں'' کے لیے قطعی طور پر جہنم کا فیصلہ ہو چکا[۹]، اور مزید یہ کہ اُسے خدا کے اس فیصلے کے خلاف اس سزا میں کسی تخفیف یا اس سے نجات کی کوئی دعا، کسی صورت میں بھی نہ کرنی چاہیے:

---

۸ کسی پر ختم قلوب کر دیا جانا، یہ اُس پر ظلم نہیں ہے، اس لیے کہ جو لوگ اپنی صلاحیتوں کی ناقدری کریں اور جانوروں کی طرح زندگی گزارنے پر قانع ہو جائیں، اُنھیں ان نعمتوں سے محروم کر دینا ہی قرین انصاف ہے۔

۹ کچھ ''احتیاط پسند'' حضرات دوسروں کے بارے میں جہنم کا فیصلہ سنانے سے اس لیے رک جاتے ہیں کہ ہوسکتا ہے کہ اُن کے پاس خدا کے حضور پیش کرنے کے لیے کوئی عذر ہو، مگر طرفہ تماشا ہے کہ یہی حضرات جب دوسروں کی تکفیر کرتے ہیں تو اس طرح کے تمام عذرات سے بالکل صرف نظر کر جاتے ہیں۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَمَاتُوۡا وَھُمۡ کُفَّارٌ اُولٰٓئِکَ عَلَیۡھِمۡ لَعۡنَۃُ اللّٰہِ وَ الۡمَلٰٓئِکَۃِ وَالنَّاسِ اَجۡمَعِیۡنَ. خٰلِدِیۡنَ فِیۡھَا لَایُخَفَّفُ عَنۡھُمُ الۡعَذَابُ وَلَا ھُمۡ یُنۡظَرُوۡنَ. (البقرہ۲:۱۶۱-۱۶۲)

''جو اپنے انکار پر قائم رہے اور مرے تو اِسی طرح منکر تھے، یقیناً وہی ہیں جن پر اللہ اور اُس کے فرشتوں اور سب لوگوں کی لعنت ہے۔ وہ اُس میں ہمیشہ رہیں گے، نہ اُن کی سزا میں کمی کی جائے گی اور نہ اُنھیں کوئی مہلت ہی ملے گی۔''

## ۴۔ دنیوی سزا

کفر کی سزا جس طرح آخرت میں دی جائے گی، اسی طرح اس دنیا میں بھی بعض اوقات اس کی سزا دی جاتی ہے۔ قرآن مجید میں اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ علما جانتے ہیں کہ اس سزا کی تمہید میں ایمان والوں کو حکم دیا جاتا ہے کہ کفر کرنے والوں سے معاشرتی طور پر قطع تعلق کر لیا جائے۔ اُن سے پیار اور محبت کے تمام رشتے کاٹ دیے جائیں۔ یہاں تک کہ اُن کے لیے مغفرت کی دعا کرنا اور ان کی میّتوں پر نماز پڑھنا بھی چھوڑ دیا جائے۔ اس مقاطعہ کے بعد اسے دو طرح سے نافذ کیا جاتا ہے۔ تند و تیز ہواؤں، طوفانوں اور سیلابوں کی صورت میں یا پھر رسولوں اور اُن پر ایمان لانے والوں کے ہاتھوں قتل اور قتال کی صورت میں۔ کفر کی پاداش میں دی جانے والی یہ دنیوی سزا، غامدی صاحب کے نزدیک تو شریعت کا بیان نہیں ہے، بلکہ یہ خدا کی سنت اور اُس کے رسولوں کے ساتھ خاص ایک قانون ہے۔ لیکن جو حضرات اس قانون کے قائل نہیں ہیں، اُن کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ دوسروں کو اگر کافر قرار دیں تو اس کے نتیجے کے طور پر دو باتوں کو بھی ضرور تسلیم کریں: اول یہ کہ اُن سے مکمل طور پر قطع تعلق کریں اور اُن کے ساتھ کسی بھی قسم کے سماجی اور معاشرتی روابط کو ختم کر دیں اور دوم یہ کہ اُن سب سے قتال، بلکہ اُن میں سے بعض کو قتل کرنا بھی لازم قرار دے ڈالیں:

لَا یَتَّخِذِ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ الۡکٰفِرِیۡنَ اَوۡلِیَآءَ مِنۡ دُوۡنِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ وَ مَنۡ یَّفۡعَلۡ ذٰلِکَ فَلَیۡسَ مِنَ اللّٰہِ فِیۡ شَیۡءٍ. (آل عمران۳:۲۸)

''ایمان والے اب مسلمانوں کو چھوڑ کر اِن کافروں کو اپنا دوست نہ بنائیں اور (یاد رکھیں) جو یہ کریں گے، اُن کو اللہ سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔''

وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓی اَحَدٍ مِّنۡھُمۡ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمۡ عَلٰی قَبۡرِہٖ اِنَّھُمۡ کَفَرُوۡا بِاللّٰہِ وَرَسُوۡلِہٖ

''اور آیندہ ان میں سے جو مر جائے، اُس (کے جنازے) پر کبھی نماز نہ پڑھنا اور نہ اُس کی قبر پر (دعا کے لیے

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

وَمَاتُوْا وَھُمْ فٰسِقُوْنَ. (التوبہ۹:۸۴)

کھڑے ہونا)، اِس لیے کہ اُنھوں نے اللہ اور اُس کے رسول کا انکار کیا ہے اور اِس حال میں مرے ہیں کہ بدعہد تھے۔''

وَنَحْنُ نَتَرَبَّصُ بِکُمْ اَنْ یُّصِیْبَکُمُ اللّٰہُ بِعَذَابٍ مِّنْ عِنْدِہٖٓ اَوْ بِاَیْدِیْنَا. (التوبہ۹:۵۲)

''اور ہم تمھارے معاملے میں جس چیز کے منتظر ہیں، وہ یہ ہے کہ اللہ تم پر اپنے ہاں سے عذاب بھیجے گا یا ہمارے ہاتھوں سے۔''

## تکفیر کا جواز

اِتمام حجت اور کفر سے کیا مراد ہے، ہم نے دیکھا کہ اس میں غامدی صاحب اور دیگر علما کے درمیان میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ ہم نے یہ بھی دیکھا کہ تفصیلات میں اس قدر اختلاف کے باوجود، ان سب میں اس بات پر مکمل اتفاق ہے کہ اگر کوئی شخص اتمام حجت کے بعد حق بات کا انکار کر دے تو اُسے بہرحال، کافر قرار دیا جا سکتا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ غامدی صاحب جب اصول میں تکفیر کو جائز قرار دیتے ہیں تو پھر کیا وجہ ہے کہ وہ آج کسی فرد، یہاں تک کہ کسی گروہ کو بھی اس کا حق دینے کو تیار نہیں ہیں۔ اس بات کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اُن کے اِس عدمِ جواز کے موقف کا تفصیلی طور پر جائزہ لیں اور یہ بھی دیکھیں کہ جو لوگ اس کے جواز کے قائل ہیں، وہ اس سلسلے میں کیا کیا دلائل دیتے ہیں۔ یہ ساری تفصیل دو عنوانات کے تحت دیکھی جا سکتی ہے: ایک عدمِ جواز اور دوسرے جواز۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

## ۱۔ عدمِ جواز

غامدی صاحب کے نزدیک تکفیر اپنی ذات میں کوئی ممنوع اور ناجائز امر نہیں ہے۔ قرآن کی بہت سی آیات اس بات پر شاہد ہیں کہ منکرین حق کو باقاعدہ کافر قرار دیا گیا اور اس حوالے سے خصوصی احکام بھی نازل کیے گئے۔ لیکن جن مقدمات اور شرائط کی بنیاد پر یہ سب کچھ ہوا، اُن کی رائے میں آج اُن کے واقع ہو جانے کا کوئی اِمکان نہیں ہے۔ اس بات کو اگر ہم چند سوالات کی صورت دیں اور ان کے بارے میں کوئی حتمی رائے قائم کر سکیں تو اُن کی رائے میں بھی اب کسی کی تکفیر کر دینا بالکل جائز ہوگا اور دوسری صورت میں یہ کام قطعی طور پر ناجائز ہو جائے گا۔ پچھلے

مباحث ہمارے سامنے رہیں تو وہ چند سوالات یہ بنتے ہیں:

اول، کیا مخاطب تک حق بات مکمل طور پر پہنچ گئی ہے؟

دوم، کیا وہ اُس کے سامنے بالکل واضح بھی ہو گئی ہے؟

سوئم، کیا اُس نے جان بوجھ کر اس کا انکار کیا ہے اور اُس کے پاس کیا اپنے اس انکار کے لیے کوئی عذر بھی موجود نہیں ہے؟

چہارم، کیا ہم اس شخص کے لیے تکفیر کے تمام نتائج بھی قبول کرنے کے لیے تیار ہیں؟

پہلے سوال کے جواب میں کسی بھی شخص کے متعلق ایک حد تک رائے ضرور قائم کی جا سکتی ہے۔ ہم یہ بات تو جانتے ہیں کہ دوسرے انسانوں کی طرح اُسے بھی باطن میں کچھ ہدایات دی گئی ہیں۔ جو صلاحیتیں اُسے حاصل ہیں، اُن کی واقفیت بہم پہنچانا بھی کچھ مشکل کام نہیں۔ اُس کے خارج میں موجود ہدایت کا ابلاغ جاننے کے لیے بھی ہمیں صرف یہ کرنا ہے کہ اُس کے ماحول کا اچھی طرح سے جائزہ لے لیں۔ یہ دیکھ لیں کہ کیا اُس کے اردگرد یہ انتظامات پائے جاتے ہیں اور یہ بھی تحقیق کر لیں کہ اُن تک اُس کی رسائی کس قدر ہے۔ ہدایت کو اُس نے ''جان'' لیا ہے یا نہیں، اس چیز کو مکمل طور پر جان لینا البتہ مشکل کام ہے، تاہم، یہ بھی ناممکن نہیں ہے۔ اُس کے ساتھ مکالمے کے نتیجے میں اسے بھی کسی حد تک جانا جا سکتا ہے۔ غرض یہ کہ ان سادی معلومات کے بعد اب ہم پورے اعتماد سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ بات مکمل طور پر اس تک پہنچ چکی ہے یا نہیں۔

دوسرے سوال کا جواب اتنا آسان نہیں ہے۔ کس پر بات مکمل طور پر واضح ہو گئی ہے اور کس پر نہیں؟ ظاہر ہے، اس بارے میں ہمارے پاس ظن اور گمان کے سوا کچھ بھی نہیں۔ کسی شخص کا دانا و بینا ہونا اور اُس تک حق بات کا ابلاغ ہو جانا یہ تو کسی حد تک جانا جا سکتا ہے، مگر اس بنیاد پر یہ بالکل نہیں کہا جا سکتا کہ وہ بات اُس پر کھل بھی گئی ہو گی، اس لیے کہ یہ دونوں چیزیں وضوح کی کوئی لزومی دلیل نہیں ہیں۔ ہم بارہا دیکھتے ہیں کہ اچھا خاصا سمجھ دار آدمی ہوتا ہے، مگر نفس کے داعیات اُس پر لاعلمی اور جہالت کے وہ دبیز پردے تان دیتے ہیں کہ وہ حق کو جانتے ہوئے بھی اُس کی تفہیم سے یک سر محروم رہ جاتا ہے۔

جہاں تک تیسرے سوال کا تعلق ہے تو ہمارے پاس بہ حیثیت انسان وہ استعداد ہی نہیں ہے کہ ہم اس کا کوئی حتمی جواب دے سکیں۔ ہم میں سے کسی کے بس میں نہیں کہ وہ لوگوں کے باطن میں جھانک کر یہ فیصلہ سنا سکے کہ حق بات کا جان بوجھ کر انکار کر دیا گیا ہے۔ یہ صرف اور صرف پروردگار عالم کی شان ہے کہ وہ دلوں کے احوال سے واقف

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ہو اور یہ جانتا ہو کہ کس دل میں ایمان نے گھر کیا ہے، اور کس میں کفر آن گھسا ہے اور اس سب کے پیچھے کون سی نیتیں اور کیا کیا ارادے کارفرما ہیں۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں بیان ہوا ہے کہ وہ اپنے باپ کے کفر کی وجوہات اور اس کے محرکات بالکل نہ جان سکے اور اُسے محض ایک ابتدائی درجے کا گمراہ سمجھتے رہے۔ یہی وجہ ہوئی کہ اُس کے لیے دعاے مغفرت کا وعدہ کیا اور اسے نبھایا بھی، حتیٰ کہ خداے علّام الغیوب نے خبر دی کہ اُن کا باپ محض خطا کار نہیں، بلکہ اُس کا کھلا دشمن ہے۔ اسی طرح کفر کا ارتکاب کرنے والے کے پاس کوئی حقیقی عذر موجود ہے یا نہیں، اسے حتمی طور پر معلوم کر لینا بھی ممکن نہیں۔ فلاں شخص ضرور صاحب استطاعت ہے، وہ غلطی سے نہیں، جان بوجھ کر یہ کام کر رہا ہے اور اس وقت اس پر کسی قسم کا کوئی جبر بھی نہیں ہے، یہ سب معاملات، بہرصورت، سادہ نہیں ہوتے۔ انسانی نفسیات کی اتھاہ گہرائیاں اور باہر سے اثر انداز ہونے والے امور کا عظیم تنوع، انھیں اس قدر پیچیدہ بنا دیتے ہیں کہ ان کا ادراک کر لینا، انسان کی دسترس سے باہر ہو جاتا ہے۔

چوتھا سوال یہ تھا کہ اس کفر کے دنیوی اور اخروی نتیجوں کے بارے میں ہماری کیا راے ہے؟ یعنی، کیا ہم اس بات کو ماننے اور اس کا برملا اظہار کرنے کے لیے تیار ہیں کہ مذکورہ شخص اب خدا کے ہاں ملعون قرار پایا ہے؟ اُس کا دل مہر بند ہو چکا ہے؟ اُسے ابدی جہنم کا مستحق قرار دے دیا گیا اور اُس سے براءت کا اظہار کرنا اور اُس کے ساتھ تمام معاشرتی روابط کو توڑ دینا، اب ہم پر لازم ہو گیا ہے؟ مزید یہ کہ اُس کے لیے اب اس کے سوا کوئی راستہ نہیں رہا کہ وہ اپنے کفر کی پاداش میں یا تو قتل کر دیا جائے[10] یا ہمیشہ کے لیے مغلوب اور زیردست بن کر رہے؟ اس سوال کا جواب دینا اس لیے ضروری ہے کہ کفر اور اس کے نتیجے، جیسا کہ پیچھے تفصیل گزری، آپس میں لازم و ملزوم ہیں۔ جو کسی کی تکفیر کرنا چاہے، اُس پر لازم ہے کہ وہ ان سب کو بھی قبول کرے، وگرنہ اس کے جواز کی بات بالکل نہ کرے۔ سردست یہ بات بھی ہمارے سامنے رہنی چاہیے کہ ان نتائج کو ماننا یا نہ ماننا تو بہت دور کی بات، کیا اس وقت مذکورہ شخص پر ان کا اطلاق شروع ہو چکا ہے؟ ہمارے پاس غیب کی ان باتوں کو جاننے کا سرے سے کوئی ذریعہ ہی نہیں ہے۔ سوائے اس ایک صورت کے کہ کوئی شخص خدا بن جانے کی جسارت کرے یا کم سے کم اپنے اوپر وحی کے اترنے کا دعویٰ کرے جو ہم جانتے ہیں کہ اب کسی طرح ممکن نہیں رہا کہ اس طرح کے تمام اِمکانات کا راستہ مستقل طور پر

---

[10] قدما کے ہاں کسی شخص کا کافر ہو جانا، کم و بیش اس کے واجب القتل ہو جانے کے مترادف ہے۔ یہاں تک کہ بعض حضرات تارکِ نماز کو بھی کافر قرار دے کر اُس کے قتل کے قائل ہو گئے ہیں۔ البتہ، اس بات میں اختلاف ہو جاتا ہے کہ اُسے دو نمازیں چھوڑنے پر قتل کیا جائے یا دو سے کم اور زیادہ نمازوں پر۔

مسدود کر دیا گیا ہے۔

یہاں ایک بات کہی جا سکتی ہے۔ وہ یہ کہ ہم دلوں کے احوال سے تو واقف نہیں، لیکن کسی شخص میں پائی جانے والی ظاہری علامتیں بہرحال اس کے دل کی حالت کا پتا دیتی ہیں۔ سو جس طرح ہم ظاہر کا اعتبار کرتے ہوئے کسی شخص کو مسلمان کہہ دیتے ہیں، اسی طرح اُسے کافر بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس استدلال کے جواب میں چند باتیں پیش نظر رہیں:

ایک یہ کہ ظاہری علامتوں سے دل کے احوال کو قطعی طور پر جان لینا، کسی صورت میں ممکن نہیں ہے۔ ان سے زیادہ سے زیادہ ایک تاثر قائم کیا جا سکتا ہے جو اپنی ذات میں صحیح بھی ہو سکتا ہے اور بالکل غلط بھی۔ اور ہم اس طرح کے تاثرات کے بارے میں یہ بھی جانتے ہیں کہ یہ کسی فیصلۂ خداوندی کے متبادل ہرگز نہیں ہو سکتے۔ دوسرے یہ کہ جب ہم کسی شخص کو مسلمان کہتے ہیں تو اس کا مطلب بھی یہ ہرگز نہیں ہوتا کہ ہم اُسے حقیقی معنی میں مسلمان کہہ رہے ہیں کہ اس مثال پر کسی دوسرے کو کافر قرار دے ڈالیں۔ حقیقی ایمان بھی دلوں کے احوال میں سے ہے اور اس کی بھی کسی کے پاس کوئی حتمی اطلاع نہیں۔ ہاں، ظاہری طور پر کسی کو مسلمان کہنا اور اُس کے ساتھ کچھ دنیوی معاملات کرنا، یہ ایسا ہی ہے جیسے ہم کسی کو غیر مسلم کہیں اور اُس کے ساتھ کچھ دنیوی معاملات کریں۔ لیکن اس پر قیاس کرتے ہوئے کسی کو کافر کہہ دینا، اس لیے جائز نہیں ہے کہ یہ معاملہ ظاہری اِنکار کا ہے ہی نہیں، بلکہ دل سے جان بوجھ کر انکار کر دینے کا ہے اور اسے یقینی طور پر جان لینے کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں[11]۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

## ۲۔ جواز

جو لوگ دوسروں کی تکفیر کرنے کے قائل ہیں، ان کی طرف سے عام طور پر یہ دلائل بیان کیے جاتے ہیں:

### ۱۔ اِباحت

اُن کا کہنا ہے کہ قرآن و حدیث میں کہیں بھی تکفیر کی ممانعت وارد نہیں ہوئی، اس لیے یہ اپنی اصل میں ایک جائز کام ہے۔ البتہ، عام لوگوں کے بجاے یہ صرف دین کے جید علما کا حق ہے اور اُنھیں بھی اس معاملے میں بہت زیادہ

---

[11] یہاں یہ خلط مبحث نہیں ہونا چاہیے کہ اگر قرائن سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ قتل جان بوجھ کر ہوا ہے تو کفر کیوں معلوم نہیں ہو سکتا؟ اس لیے کہ تکفیر میں نیت اور ارادے کا علم ہونا ضروری ہوتا ہے جو بالکل محال ہے۔ حتیٰ کہ قتل میں بھی قرائن صرف یہ بتاتے ہیں کہ یہ کام غلطی سے نہیں، ارادۃً ہوا ہے۔ یہ نہیں بتاتے کہ اس کے پیچھے ارادہ کیا تھا۔

محتاط رہنا چاہیے۔

## ۲۔آیات

تکفیر کے جواز کی ایک دلیل یہ دی جاتی ہے کہ قرآن کی بہت سی آیات اپنے منکرین کو کافر کا نام دیتی ہیں، جیسا کہ یہ آیت:

وَعَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَ هُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ وَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا سٰحِرٌ كَذَّابٌ. (ص ۳۸: ۴)

''اِنھیں تعجب ہے کہ ان کے پاس ایک خبردار کرنے والا اِنھی میں سے آ گیا ہے اور اِن کافروں نے کہہ دیا کہ یہ ساحر ہے، سخت جھوٹا ہے۔''

کئی آیتوں میں کچھ خاص اعمال کی بنیاد پر اُنھیں کافر قرار دیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ آج بھی جن میں یہ اعمال پائے جائیں، انھیں کافر کہا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر ذیل کی یہ آیت:

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ. (المائدہ ۵: ۴۴)

''اور جو لوگ اللہ کے اتارے ہوئے قانون کے مطابق فیصلے نہ کریں، وہی کافر ہیں۔''

بلکہ ایک آیت میں صرف تکفیر ہی نہیں، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات کا باقاعدہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ منکرین کو کافر کہہ کر مخاطب کریں:

قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ. (الکافرون ۱۰۹: ۱)

''تم اعلان کرو، (اے پیغمبر) کہ اے کافرو۔''

## ۳۔احادیث

کئی حدیثوں میں لوگوں کا ایمان ختم ہونے کی بات کی گئی ہے، جیسے یہ حدیث:

يمرقون من الدين مروق السهم من الرمية. (مسلم، رقم ۲۴۵۵)

''وہ لوگ دین سے اس طرح نکل جائیں گے، جس طرح تیر اپنے ہدف کو چیر کر نکل جاتا ہے۔''

کئی احادیث میں قرآن ہی کی طرح مختلف گناہوں پر کفر کا اطلاق کیا گیا ہے اور ظاہر ہے، اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ جو کوئی ان کفریہ اعمال کا ارتکاب کرے گا، وہ کافر قرار پا جائے گا، جیسا کہ ذیل کی یہ حدیث:

سباب المسلم فسوق وقتاله كفر. (بخاری، رقم ۴۸)

''مسلمان کو گالی دینا فسق اور اُس سے لڑائی کرنا کفر ہے۔''

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

بعض احادیث وہ بھی ہیں جن میں لوگوں کے لیے 'کفر' کے لفظ سے آگے بڑھ کر 'کافر' کا لفظ بھی استعمال کیا ہے، جیسا کہ یہ حدیث:

لا ترجعوا بعدي كفارًا يضرب بعضكم رقاب بعض. (بخاری، رقم ۱۲۱) ''میرے بعد کافر نہ ہو جانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں مارتے پھرو۔''

اور یہ حدیث:

إذا قال الرجل لأخيه يا كافر فقد باء به أحدهما. (بخاری، رقم ۶۱۰۳) ''جب کوئی شخص اپنے بھائی کو کافر کہتا ہے تو دونوں میں سے ایک پر یہ لفظ چسپاں ہو کر رہتا ہے۔''

ایک حدیث میں کچھ علامتوں کو بیان کیا گیا ہے جن کی بنیاد پر ہم کسی کے دل میں پائے جانے والے کفر کا فیصلہ کر سکتے ہیں:

اٰية المنافق ثلاث: إذا حدث كذب، وإذا وعد أخلف، وإذا ائتمن خان. (مسلم، رقم ۲۱۱) ''منافق کی تین علامتیں ہیں: جب بات کرے تو جھوٹ بولے، وعدہ کرے تو خلاف ورزی کرے اور اس کے پاس امانت رکھی جائے تو اس میں خیانت کرے۔''

بعض احادیث میں کچھ اقدامات کا ذکر ہوا ہے جو دوسروں کی تکفیر پر منحصر ہیں، جیسا کہ یہ حدیث:

من بدل دينه فاقتلوه. (بخاری، رقم ۳۰۱۷) ''جو اپنا دین بدل لے، اُسے قتل کر دو۔''

ایک حدیث یہ ہے:

إلا أن تروا كفرًا بواحًا عندكم من الله فيه برهان. (مسلم، رقم ۴۷۷۱) ''تم حکمرانوں سے اقتدار کے معاملے میں جھگڑا صرف اُس صورت میں کر سکتے ہو جب کوئی کھلا کفر اُن کی طرف سے دیکھو اور تمھارے پاس اس معاملے میں اللہ کی واضح حجت موجود ہو۔''

## ۴۔ متفرق دلائل

۱۔ قرآن مجید میں بیان ہوا ہے کہ عالم ارواح میں خدا نے آدم علیہ السلام کی اولاد سے یہ عہد لیا: کیا میں تمھارا رب نہیں ہوں؟ سب نے اقرار کیا: ہاں، آپ ہی ہمارے رب ہیں۔ یہ عہد اس بات کی واضح دلیل ہے کہ خدا کے

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

وجود کے معاملے میں ہر انسان پر اِتمام حجت ہو چکا ہے اور اس کے لیے علیحدہ سے کسی اہتمام کی ضرورت نہیں۔ چنانچہ آج ملحدین اگر خدا کا انکار کریں تو کم سے کم اُنھیں اس عہد کی بنیاد پر کافر ضرور قرار دیا جا سکتا ہے۔

۲۔ سیدنا صدیق رضی اللہ عنہ کے بارے میں ہم جانتے ہیں کہ انھوں نے اپنے دور خلافت میں مرتدین سے قتال کیا۔ ظاہر ہے، کچھ لوگوں کو مرتد قرار دے دینا، اصل میں اُن کی تکفیر کرنا ہی تھا۔ اور اسی طرح کا معاملہ اُس وقت بھی ہوا جب سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے زمانے میں خوارج سے قتال کیا گیا۔

۳۔ جو لوگ ہمیں کافر قرار دیں، اُنھیں محض اس وجہ سے کافر کہا جا سکتا ہے کہ وہ ہم مسلمانوں کو کافر قرار دے رہے ہیں۔ اسی طرح جو لوگ اسلام کا انکار کریں اور خود اپنے آپ کو کافر کہیں، اُنھیں کافر کہنا بھی بالکل جائز ہونا چاہیے۔

## جواز کے دلائل کا تجزیہ

علماے اسلاف ہوں یا اخلاف، تکفیر کے جواز میں کم و بیش یہی دلائل ہیں جو ان کی طرف سے پیش کیے جاتے ہیں۔ ذیل میں ہم ان سب کا مختصر سا تجزیہ پیش کرتے ہیں:

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

### ۱۔ اِباحت

اباحت کے اس اِستدلال کو دو طرح سے پیش کیا جا سکتا ہے: ایک اس طرح سے کہ دوسرے بہت سے عام امور کی طرح یہ تکفیر بھی اپنی ذات میں ایک جائز امر ہے، اس لیے کہ دین میں اس کی ممانعت پر کوئی دلیل وارد نہیں ہوئی۔ دوسرے اس طرح سے کہ یہ تکفیر اپنی ذات میں عام نہیں، بلکہ دینی نوعیت رکھنے والا ایک امر ہے، مگر یہ اس لیے جائز ہے کہ دین میں اس کی ممانعت پر کوئی دلیل وارد نہیں ہوئی۔

پہلے اِستدلال کے جواب میں واضح ہو کہ تکفیر کسی شخص کا ذاتی معاملہ نہیں ہے کہ اس میں اباحت کے عمومی قاعدے سے استدلال کیا جا سکے۔ یہ دوسرے لوگوں سے براہ راست متعلق اور اُن کے بارے میں ایک فیصلہ سنا دینا ہے کہ جس کے نتیجے میں بہت سی شرعی حرمتیں اب قائم نہیں رہیں گی۔ اگر دوسروں کے متعلق فیصلے محض اِباحت کے اصول پر جائز قرار دیے جا سکتے ہیں تو پھر چوری کے مقدمے میں بھی مثال کے طور پر، قاضی کے ساتھ ساتھ ہر غیر قاضی کو یہ حق دے دینا چاہیے کہ وہ اُٹھے، اپنی عدالت سجائے اور ملزم کے ہاتھ کاٹ دینے کا حکم سنا دے۔ ہم جانتے ہیں کہ ہر مقدمے میں ہمیشہ پہلے اس بات کو ثابت کیا جاتا ہے کہ عدالت کیا اس کی سماعت کا حق بھی رکھتی ہے یا نہیں۔ سو تکفیر

کی بحث میں بھی یہ لازم ہے کہ اِباحت کے عمومی قاعدے سے دلیل فراہم کرنے کے بجاے پہلے علما کے حقِ فیصلہ کو ثابت کیا جائے جو اُنھیں اس بات کا اختیار دیتا ہو کہ وہ لوگوں کے دلوں میں جھانک کر اُن کے ایمان اور کفر کا فیصلہ سنا سکتے ہیں۔

دوسرے استدلال کے جواب میں ایک بنیادی اصول سامنے رہنا چاہیے۔ وہ یہ کہ دنیا کا ہر کام اپنی اصل میں مباح اور جائز ہے، یہاں تک کہ اُس کی حرمت پر کوئی شرعی دلیل قائم ہو جائے۔ اس کے مقابلے میں دین کے نام سے کیا جانے والا ہر کام اپنی ذات میں غیر مباح اور ناجائز ہے، سوائے اِس ایک صورت کے کہ اُس کے حق میں کوئی شرعی دلیل قائم کر دی جائے۔ اگر تکفیر ایک دینی امر ہے تو اس کے لیے اِباحت کے اصول سے کسی بھی صورت میں استدلال نہیں کیا جا سکتا، بلکہ ضروری ہے کہ اسے اُس وقت تک عمل میں نہ لایا جائے جب تک کوئی شرعی دلیل اس کا تقاضا نہ کرے۔ بغیر شرعی دلیل کے کسی کام کو دین قرار دے دینا، اصطلاح میں 'بدعت' کہلاتا ہے جو خدا کے ہاں نہ صرف یہ کہ ناقابل قبول ہے، بلکہ دین میں اضافہ کرنے کی وجہ سے قابل مواخذہ بھی ہے۔ مزید یہ بات بھی یاد رہے کہ تکفیر دوسری بے ضرر بدعات کے مقابلے میں اس لیے بھی دلیل کی زیادہ محتاج ہے کہ اس پر بعض اوقات لوگوں کی زندگی اور موت بھی منحصر ہو جایا کرتی ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

## ۲۔ آیات

اس میں شک نہیں کہ قرآن نے بہت سے مقامات پر اپنے مخاطبین کے لیے ''کافر'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ یہ استعمال لفظ کے لغوی اعتبار سے بھی ہوا ہے اور خالص مذہبی اعتبار سے بھی۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ بہت سے مقامات پر اس لفظ کو اصطلاحی معنی میں بھی برتا گیا ہے۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ تکفیر کے جواز کی بحث میں اس طرح کے اصطلاحی استعمالات بھی اِثبات مدعا میں بالکل بے فائدہ ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ غامدی صاحب کی راے میں تکفیر کی مطلق نفی نہیں کی گئی کہ اُن کے سامنے یہ آیتیں پڑھی جائیں، بلکہ وہ اس کے اصلاً جائز ہونے کے قائل ہیں، جیسا کہ پیچھے بیان ہوا۔ اُن کے نزدیک خدا اس بات کا پورا پورا حق رکھتا ہے کہ وہ کسی شخص کو کافر قرار دے اور قرآن مجید کے مذکورہ مقامات میں اُس کے اِسی حق کا اظہار ہوا ہے۔ سوال صرف یہ ہے کہ خدا کی ذات کے سوا کسی اور کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ وہ خدا ہی کی طرح لوگوں کو کافر قرار دے سکے؟ اگر یہ حق کسی اور کو حاصل نہیں تو ان آیتوں میں محض 'کافر' کا لفظ دیکھ کر اپنے لیے تکفیر کا استدلال کرنا بالکل ایسا ہی ہوگا جیسے کوئی شخص خدا کے حاکم، مالک اور بادشاہ ہونے کی

حیثیت سے کیے گئے فیصلوں کی آیتیں پڑھے اور اس بنیاد پر اپنے آپ کو بھی ان فیصلوں کا مجاز سمجھنا شروع کر دے۔

جن آیات میں بعض اعمال کی بنیاد پر کافر کہا گیا ہے، اُن پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ دو طرح کی ہیں: ایک وہ ہیں کہ جن میں کفر یہ اعمال پر کافر ہو جانے کی مطلق بات کی گئی ہے، جیسا کہ یہ آیت:

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ. (المائدہ ۵: ۴۴)

''اور جو لوگ اللہ کے اتارے ہوئے قانون کے مطابق فیصلے نہ کریں، وہی کافر ہیں۔''

اور دوسری وہ ہیں کہ جن میں کفر یہ اعمال پر کچھ لوگوں کے کافر ہو جانے کی بات ہوئی ہے۔ جیسا کہ یہ آیت:

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَّيُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا. اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا. (النساء ۴: ۱۵۰-۱۵۱)

''جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں کے منکر ہو رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اُس کے رسولوں کے درمیان تفریق کریں اور کہتے ہیں کہ کسی کو مانیں گے اور کسی کو نہیں مانیں گے اور چاہتے ہیں کہ ایمان اور کفر کے بیچ میں کوئی راہ نکالیں، وہی پکے کافر ہیں اور ہم نے ان کافروں کے لیے رسوا کر دینے والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔''

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اول الذکر آیات کے بارے میں واضح ہو کہ وہ صرف یہ بیان کر رہی ہیں کہ فلاں اور فلاں کام کفر ہے، اس لیے ان کا ارتکاب کرنے والا کافر۔ یعنی، وہ صرف قانون کا بیان کر رہی ہیں، نہ کہ اُس کے اِطلاق کا۔ چنانچہ ان سے استدلال کرتے ہوئے یہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا کہ جو شخص بھی یہ کفر کرے گا، وہ لازماً کافر قرار پا جائے گا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی بنیاد پر ہمیں بھی یہ حق حاصل ہے کہ قرآن کے انداز میں اس بات کو ہم ایک اصول اور قاعدے کی صورت میں بیان کر دیں۔ مثال کے طور پر ہم یہ کہیں کہ جو شخص خدا کی کتاب کے مطابق فیصلہ نہ کرے، وہ کافر ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر خاص زید اور بکر کے بارے میں یہ کہنا کہ چونکہ اُنھوں نے یہ فیصلہ نہیں کیا، اس لیے وہ کافر ہو گئے ہیں، یہ اپنے حدود سے صریحاً تجاوز ہے اور اس کے لیے ان آیتوں میں کوئی دلیل نہیں ہے۔

جن آیتوں میں کفر یہ اعمال پر بعض لوگوں کے کافر ہو جانے کی بات ہوئی ہے، وہ دراصل، اُنھی لوگوں کے بارے میں ہو چکے خدائی فیصلے ہیں۔ ان سے یہ نتیجہ بالکل نہیں نکالا جا سکتا کہ کفر کرنے والے ہر شخص کو اب اس طرح کے فیصلوں کی بنیاد پر کافر کہا جا سکتا ہے[۱۲]۔ جب عدالت میں کسی شخص کو مجرم قرار دے دیا جاتا ہے تو اُس کا مطلب یہ

۱۲؎ شروع زمانے میں جب یہ روش چل پڑی کہ اس طرح کی آیتوں کو دوسرے لوگوں پر بھی چسپاں کیا جانے لگا تو ابن عمر

ہرگز نہیں ہوتا کہ اب رہتی دنیا تک محض یہ فیصلہ ہر ملزم کو مجرم بنا دیا کرے گا۔ بلکہ ضروری ہوتا ہے کہ ہر مرتبہ نئے سرے سے عدالت قائم ہو، اُس کا حقِ سماعت بھی ثابت ہو، شہادتیں سنی اور دیکھی جائیں اور اُن کی روشنی میں کسی ملزم کو مجرم قرار دے کر سزا سنائی جائے یا باعزت بری کر دیا جائے۔ لہٰذا، صحیح بات یہی ہے کہ ہم ان آیات کے اتباع میں اُنھی افراد اور گروہوں کو کافر کہیں جو اِن میں مذکور ہوئے۔ اور ایسا کرتے ہوئے ہم اُن کی تکفیر نہیں کریں گے، بلکہ اُن کے بارے میں سنائے جا چکے خدائی فیصلوں کی صرف حکایت اور اُس کا اعلان ہی کریں گے۔

یہاں ایک سوال اٹھایا جا سکتا ہے کہ یہ آیتیں، صحیح ہے کہ کچھ لوگوں کے ساتھ مخصوص ہیں، مگر جن اوصاف کی وجہ سے اُنھیں کافر قرار دیا گیا ہے، وہ اوصاف اگر کسی اور میں بھی پائے جاتے ہوں تو کیا اُن پر بھی اس کا اطلاق نہیں ہو جانا چاہیے؟ اس کے جواب میں یہ اصول یاد رہے کہ ہر آیت اپنے اندر پائی جانے والی علت کی بنیاد پر دوسروں تک ممتد ہوتی ہے۔ یہاں علت اُن لوگوں کا محض انکار کرنا نہیں، بلکہ جانتے بوجھتے ہوئے اور بغیر کسی عذر کے انکار کر دینا ہے۔ اور ظاہر ہے، اس طرح کی کسی علت کی خبر ہمیں ہو سکے، اس بات کا کوئی امکان ہی نہیں کہ ہم اس بنیاد پر ان آیتوں کے حکم کا کسی دوسرے شخص پر اطلاق کر سکیں۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

باقی رہی وہ آیت کہ جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا گیا ہے کہ وہ لوگوں کو کافر کے لفظ سے خطاب کرتے ہوئے براءت کا اظہار کریں تو اس سے بھی تکفیر کے جواز پر استدلال کرنا ممکن نہیں ہے۔ اول تو آپ کو اس بات کا حکم اللہ دے رہا ہے جو حقیقت حال سے خوب واقف اور کسی کو بھی کافر قرار دینے کا پورا پورا حق رکھتا ہے۔ دوسرا یہ کہ وہ خاص اُن لوگوں کے متعلق یہ حکم دے رہا ہے کہ جن پر اس کی طرف سے ختم قلوب ہو چکا اور یہ طے ہے کہ وہ اُس کے پیغمبر کی دعوت پر کبھی بھی ایمان نہ لائیں گے۔ چنانچہ اگلی آیت میں فرمایا ہے: 'وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ'، ''نہ تم کبھی (تنہا) اُس کی عبادت کرو گے جس کی عبادت میں کرتا ہوں'' (الکافرون ۱۰۹: ۳)۔ سو اس آیت سے تکفیر کا جواز اُسی صورت میں پیدا کیا جا سکتا ہے جب مکفر خدائی صفات کا حامل ہو، اور جن لوگوں کی تکفیر اُس کے پیش نظر ہے، اُن کے دلوں پر مہر ہو جانے سے اچھی طرح واقف بھی ہو چکا ہو۔

## ۳۔ احادیث

بعض احادیث میں یہ مضمون بیان ہوا ہے کہ کچھ لوگ دین سے اس طرح نکل جائیں گے، جس طرح تیر اپنے

---

رضی اللہ عنہ نے اس پر سخت نکیر فرمائی (بخاری، ص ۱۴۵۴)۔

ہدف کو چیر کر نکل جاتا ہے۔ اس سے بعض حضرات نے یہ نکتہ پیدا کیا ہے کہ کسی کا دین سے نکل جانا اصل میں اُس کا کافر ہو جانا ہے اور کسی کا کافر ہو جانا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ ہم اُسے کافر قرار دے سکتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دنیا میں ہر دم کفر کا ارتکاب ہوتا ہوگا اور لوگ دین سے نکل کر کافر بھی ہو جایا کرتے ہوں گے، مگر کسی شخص کا واقعے میں کافر ہو جانا اور دوسروں کا اِس حقیقت کو جان کر اُسے کافر قرار دے دینا، یہ دو مختلف باتیں ہیں اور ان دونوں میں کوئی لزوم بھی نہیں کہ ایک کا اِثبات دوسری کو لازم کر دے۔ بلکہ واقعے میں تو لوگ جنت اور جہنم کے بھی مستحق ہو جاتے ہوں گے، مگر ہم جانتے ہیں کہ اس بنیاد پر کسی شخص کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ لوگوں کو جنتی اور جہنمی قرار دیتا پھرے۔ بحث دراصل اس بات میں نہیں ہے کہ دنیا میں کفر واقع ہو رہا ہے یا نہیں؟ بحث اس بات میں ہے کہ جب کوئی شخص ظاہر میں دین سے نکل جائے تو کیا ہم اُسے یہ کہتے ہوئے کافر قرار دے سکتے ہیں کہ اُس نے یہ کفر جان بوجھ کر کیا ہے؟ اگر کوئی اس کا جواب ہاں میں دے تو پھر سوال یہ ہے کہ ان روایات میں ہمارے اِس استحقاق کی دلیل کیا ہے؟ کیونکہ روایات تو اس سے زیادہ کچھ نہیں بتا رہیں گے کہ آنے والے دنوں میں یہ واقعہ ہو کر رہے گا کہ بظاہر مسلمان کہلانے والے کچھ لوگ حقیقت میں دین اسلام سے نکل جائیں گے، یعنی بالکل کافر ہو کر رہ جائیں گے۔[13]

احادیث میں بعض اعمال کو کفر قرار دیا گیا ہے، جیسا کہ فرمایا ہے: مسلمان کو گالی دینا فسق اور اُس سے لڑائی کرنا کفر ہے۔ اس سے یہ دلیل اٹھائی گئی ہے کہ جو لوگ کفریہ اعمال کا ارتکاب کریں، اُنھیں کافر کہا جا سکتا ہے۔ واضح رہے کہ نیکی اور بدی کی طرح کفر کے بھی بہت سے درجات ہیں۔ ان میں سے ابتدائی درجے کے کفر شدید نوعیت کے گناہ تو ہوتے ہیں، مگر اس معنی میں کفر نہیں ہوتے کہ اپنے مرتکب کو کافر بنا ڈالیں۔ کسی مسلمان سے لڑائی کرنا کفر ہے، مگر یہ بھی اُس درجے کا کفر ہے جو اپنی شناعت میں شدید ہونے کے باوجود اپنے مرتکب کو کافر نہیں بنا ڈالتا۔ اور یہی وجہ ہے کہ قرآن نے آپس میں لڑائی کرنے والے مسلمانوں کو اِس کفر کے ہوتے ہوئے بھی کافر قرار نہیں دیا۔[14] لہٰذا، اس طرح کے کسی کفر پر تکفیر کرنے کا جواز ثابت کرنا کسی بھی طرح صحیح نہیں۔ بلکہ فرض کیجیے، اگر کسی روایت میں آخری درجے کا کفر بیان ہو، تب بھی اُس سے فقط یہی کہنا ثابت ہوگا کہ یہ کفر ہے اور اس کا ارتکاب کرنے والا کافر۔ یہ ثابت نہ ہوگا کہ جو اس کفر کا ارتکاب کرے، اُس خاص شخص کو کافر قرار بھی دے دیا جائے، اس لیے کہ کسی

---

[13] یہی وجہ ہے کہ اول زمانے میں جب بعض لوگوں کو 'مروق السهم من الرمية' کی ان روایات کا مصداق سمجھا گیا تو اُنھیں بھی کم سے کم کافر قرار نہیں دیا گیا۔

[14] الحجرات ۴۹: ۹-۱۰۔

شخص کا کفر میں پڑنا اور کافر ہو جانا ایک چیز ہے اور اُسے کافر قرار دے دینا بالکل دوسری چیز ہے۔

کچھ روایات کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ان میں صرف کفر کا ذکر نہیں ہوا، بلکہ اس کا ارتکاب کرنے والوں کے لیے 'کافر' کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے اور اسی وجہ سے یہ پچھلی روایات کی نسبت تکفیر کی ایک بڑی دلیل بن گئی ہیں، جیسا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ لوگوں کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا: ''میرے بعد کافر نہ ہو جانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں مارتے پھرو۔'' جہاں تک اس روایت کا تعلق ہے تو واضح رہے کہ اس سے بھی تکفیر پر دلیل نہیں لائی جا سکتی۔ ایک تو اس لیے کہ اس میں بیان کردہ کفر بھی اُس نوعیت کا نہیں ہے جو کسی شخص کو کافر بنا دے۔ اور یہی وجہ ہے کہ قرآن نے اُس مسلمان کو جس نے دوسرے مسلمان کی گردن ماردی ہو، کافر قرار نہیں دیا، بلکہ مسلمان سمجھتے ہوئے اُس کے ساتھ قصاص کا معاملہ کیا ہے[15]۔ دوسرے اس لیے کہ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اگر تم ایک دوسرے کی گردنیں مارو گے تو کافر ہو جاؤ گے اور دوسروں کو بھی تمھیں کافر کہنے کا حق حاصل ہو جائے گا۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم ایک دوسرے کی گردنیں مارا کرتے تھے۔ اسلام قبول کرنے کے بعد اللہ نے تمھارے اندر محبت اور الفت پیدا کر دی ہے۔ دیکھو، اب لوٹ کر پھر وہی کافروں والے کام نہ شروع کر دینا۔ اس روایت میں ''کافر نہ ہو جانا'' سے مراد ''کافروں کے سے کام نہ کرنا'' ہے۔ یہ ایسا ہی اسلوب ہے جیسے ہم کسی شخص کو جو سکھ سے مسلمان ہوا ہو اور اُس کے بارے میں اندیشہ ہو کہ وہ دوبارہ سے پگڑی باندھ لے گا، کہیں کہ دیکھو، تم دوبارہ سے سکھ نہ ہو جانا کہ سر پر پگڑی باندھے پھرو۔ ظاہر ہے، اس جملے میں متکلم کی مراد یہ بالکل نہیں ہے کہ پگڑی باندھنے سے تم اسلام کے دائرے سے نکل کر دوبارہ سے سکھ ہو جاؤ گے، بلکہ وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ تم مسلمان ہو کر اس طرح کے سب کام چھوڑ چکے ہو، اس لیے اب دوبارہ سے سکھوں جیسے کام نہ کرنا۔

فرمایا ہے کہ جو شخص اپنے بھائی کو کافر کہتا ہے، اگر وہ حقیقت میں کافر نہ ہو تو یہ کفر اُس پر لوٹ آتا ہے۔ اس حدیث سے تکفیر کے قائلین نے استدلال کیا ہے کہ یہ الفاظ ہمیں تکفیر کا حق اس تنبیہ کے ساتھ دے رہے ہیں کہ اس کام کو حد درجہ احتیاط کے ساتھ کیا جائے، وگرنہ عین ممکن ہے کہ یہ کفر ہم پر لوٹ آئے۔ واضح رہنا چاہیے کہ یہ حدیث کسی مفتی اور قاضی کے لیے کسی فقہی اور قانونی حق کا سرے سے کوئی بیان نہیں کر رہی کہ اس سے تکفیر کرنے کا حق کشید کیا جا سکے۔ ایسا ہوتا تو اس میں یہ کبھی نہ کہا جاتا کہ اگر تکفیر کا اِطلاق صحیح نہ ہوا تو اس کا وبال مکفر پر آن پڑے گا۔ ہم جانتے ہیں کہ انسان جب تک انسان ہے، اس بات کا اِمکان ہر وقت موجود ہے کہ وہ فیصلہ سنانے میں غلطی کرے اور حقیقت

[15] البقرہ ۲: ۱۷۸۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

کے خلاف کوئی فیصلہ سنا دے۔ اب یہ بات مبنی بر ظلم ہو گی کہ اُسے اِس پر بھی گناہ اور سزا کی وعید سنا دی جائے۔ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بارے میں فرمایا تھا کہ تم اپنے مقدمات میرے پاس لے کر آتے ہو اور میں ایک انسان ہی ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ تم میں سے ایک فریق دوسرے کی نسبت اپنے دلائل کو زیادہ اچھے طریقے سے بیان کرے اور میں اُس کے حق میں فیصلہ دے دوں[۱۶]۔ بلکہ ہم جانتے ہیں کہ احادیث میں تو اس طرح کے غلط فیصلوں پر کسی گناہ اور وبال کی نہیں، بلکہ کم سے کم ایک اجر ملنے کی نوید سنائی گئی ہے[۱۷]۔ لہٰذا، یہ بات بالکل واضح ہے کہ یہ روایت دوسروں کو کافر قرار دینے کا حق بیان نہیں کر رہی۔ بلکہ اس کے اسلوب پر اگر غور کیا جائے تو یہ اُلٹا روک رہی ہے کہ ہم یہ کام بالکل نہ کریں اور جو شخص اپنے آپ کو مسلمان کہہ رہا ہو، اسے کافر ہرگز نہ کہیں۔ اس لیے کہ اگر وہ حقیقت میں کافر ہوا تو اِس صورت میں یہ خیر رہے گی کہ ہم ایک واقعی کافر کو کافر کہیں گے، مگر اُس کے ظاہری ایمان کی نفی کر کے ایک بڑی غلطی کا ارتکاب بہرحال ضرور کریں گے۔ اور اگر وہ کافر نہ ہوا تو اِس صورت میں ہم اُس پر کفر کی تہمت جڑیں گے اور اِس طرح ظاہر ہے خود ایک بڑے کفر کا ارتکاب کر بیٹھیں گے۔ گویا دونوں صورتوں میں یہ ایک ناجائز اور غلط کام ہو گا جس سے ایک مسلمان کو بہرصورت بچنا ہی چاہیے[۱۸]۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

نفاق کے بارے میں آئی ہوئی روایات بنیادی طور پر دو طرح سے بیان ہوئی ہیں۔ ایک اس طرح سے:

آیة المنافق ثلاث: إذا حدث کذب، وإذا وعد أخلف، وإذا ائتمن خان. (مسلم، رقم ۲۱۱)

''منافق کی تین علامتیں ہیں: جب بات کرے تو جھوٹ بولے، وعدہ کرے تو خلاف ورزی کرے اور اُس کے پاس امانت رکھی جائے تو اُس میں خیانت کرے۔''

دوسرے اس طرح سے:

أربع من کن فیه کان منافقًا خالصًا، ومن کانت فیه خلة منهن کانت فیه خلة

''چار عادتیں ایسی ہیں کہ وہ جس میں پائی جائیں وہ پکا منافق ہے اور اگر ان میں سے ایک پائی جائے

---

۱۶؎ بخاری، رقم ۷۱۶۹۔

۱۷؎ مسلم، رقم ۴۴۸۷۔

۱۸؎ یہ اسلوب ایسا ہی ہے جیسے ہم کسی شخص کو دشنام طرازی سے روکنا چاہیں اور کہیں کہ دیکھو، تم فلاں شخص کو کمینہ کہہ رہے ہو۔ اگر وہ واقعہ میں ایسا ہوا تو تمھاری بات تو غلط نہیں، مگر گالی ہونے کی وجہ سے یہ غلطی ضرور ہے۔ اور اگر یہ اُس پر الزام ہے تو اس طرح کا الزام لگا کر تم تو اپنا کمینہ پن بہرحال دکھا چکے۔

من نفاق حتی یدعها: إذا حدث کذب، وإذا عاهد غادر، وإذا وعد أخلف، وإذا خاصم فجر. (مسلم، رقم ۲۱۰)

تو اُس میں نفاق کی ایک عادت پائی جاتی ہے، یہاں تک کہ وہ اسے چھوڑ دے۔ وہ عادتیں یہ ہیں: جب بات کرے جھوٹ بولے، جب عہد باندھے توڑ دے، وعدہ کرے تو خلاف ورزی کرے اور جب کسی سے لڑے تو برائی کا ارتکاب کرے۔''

ان روایات سے استدلال کیا گیا ہے کہ بعض علامتوں کو دیکھ کر اگر ہم دوسروں کے نفاق کا فیصلہ کر سکتے ہیں جو اپنی حقیقت میں کفر ہی کی ایک صورت ہے تو ہم دوسروں کے کافر ہو جانے کا فیصلہ بھی کر سکتے ہیں۔ غور کیا جائے تو اس استدلال میں روایت کے الفاظ اور اُس کے اُسلوب سے صرف نظر ہو گیا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ مدینہ اور اس کے گرد و نواح میں کچھ لوگ بظاہر مسلمان، مگر حقیقت میں پکے منافق تھے، اور اُن کی اس منافقت کا پردہ قرآن نے جگہ جگہ چاک کیا ہے۔ اسی سلسلے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی کچھ علامتیں بیان فرمائی ہیں۔ ان میں عام طور پر یہ برائیاں پائی جاتی تھیں کہ وہ بات بات پر جھوٹ بولتے، امانتوں میں خیانت کرتے، کسی عہد اور وعدے کا پاس نہ کرتے اور جھگڑا ہو جاتا تو بداخلاقی کی سب حدوں کو پھلانگ جایا کرتے تھے۔ مزید یہ کہ اُس وقت یہ برائیاں مسلمانوں کے بجاے منافقین ہی میں پائی جاتی تھیں، اس لیے یہ ایک لحاظ سے اُن کی علامتیں قرار پا گئی تھیں۔ آپ نے اسی تناظر میں فرمایا کہ یہ چیزیں جس میں پائی جائیں، وہ چاہے اپنے آپ کو مسلمان کہے، پکی بات ہے کہ وہ مسلمان نہیں، بلکہ منافق ہے۔ گویا ان علامتوں کا ذکر کر کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیش نظر اُن لوگوں کی پہچان بتانا تھا جو پہلے سے منافق تھے۔ آپ کے پیش نظر یہ بتانا ہرگز نہیں تھا کہ جن جن میں یہ علامتیں ہوں گی، وہ ضرور اسلام کے دائرے سے باہر نکل کر منافق ہو جائیں گے۔ چنانچہ اس روایت سے بعض علامتوں کی بنیاد پر کسی کو منافق اور کسی کو کافر قرار دینے کا قاعدہ اخذ کر لینا کسی طرح بھی صحیح نہیں ہے، وگرنہ یہ ''سخن فہمی'' کی ایسی ہی مثال ہو گی کہ کوئی نیم حکیم کسی حاذق طبیب کی یہ بات سن کر کہ بخار اور کھانسی تپ دق کی علامتیں ہوا کرتی ہیں، ہر اُس شخص کو تپ دق کا مریض قرار دے بیٹھے جو اُسے بخار اور کھانسی میں مبتلا نظر آئے۔

'من بدل دینه فاقتلوه' (جو کوئی اپنا دین تبدیل کرے، اُسے قتل کر دو)۔ اس روایت سے استدلال کیا گیا ہے کہ اس میں کافر قرار دینے کا باقاعدہ جواز پایا جاتا ہے، اس لیے کہ اس میں قتل کرنے کا جو حکم دیا گیا ہے، وہ اُسی صورت میں پورا ہو سکتا ہے جب متعین طور پر اِرتداد کا حکم لگایا جا چکا ہو۔ اِسی طرح کا استدلال اُس روایت سے بھی

کیا گیا ہے جس میں فرمایا ہے کہ تم حکمرانوں کے خلاف خروج نہیں کر سکتے، یہاں تک کہ اُن کی طرف سے کفر بواح ہوتا دیکھ لو۔ یعنی، خروج تب تک نہیں ہو سکتا جب تک حکمرانوں کی تکفیر نہ کر دی جائے۔

جہاں تک پہلی روایت کا تعلق ہے تو وہ اس بحث میں غامدی صاحب کے سامنے بطور دلیل پیش نہیں کی جا سکتی۔ اس لیے کہ یہ روایت اُن کے نزدیک شریعت کا بیان نہیں، بلکہ خدا کی سنت سے متعلق ایک معاملے کا بیان ہے۔ اُن کی اس بات کی تفصیل یہ ہے کہ جب رسولوں کی طرف سے اُن کی قوموں پر اتمام حجت کر دیا جاتا ہے تو اس کے بعد اُن کے منکرین پر خدا کا عذاب نازل ہو کر رہتا ہے۔ اس کی ایک صورت یہ بھی ہوتی ہے کہ مومنین کی تلواریں اس عذاب کا ذریعہ بنا دی جائیں۔ یہ تلواریں جس طرح منکرین پر بے نیام ہو جاتی ہیں، اسی طرح وہ لوگ بھی اس کی زد میں آ جاتے ہیں جو اسلام میں داخل ہو کر پھر مرتد ہو جائیں، اس لیے کہ وہ اپنے ارتداد کے نتیجے میں دوبارہ سے منکرین کی صف میں جا ملتے ہیں۔ مذکورہ روایت میں اسی طرح کے لوگوں کے لیے جو اپنا دین بدل کر پھر سے منکر ہو جائیں، خدائی عذاب کا امتداد بیان ہوا ہے۔ غامدی صاحب کے نزدیک یہ سارا معاملہ چونکہ رسولوں کے ساتھ خاص ایک خدائی سنت کا بیان ہے، اس لیے اس سے تکفیر کی شریعت پر استدلال کرنا ممکن نہیں ہے۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ اگر ہم مان بھی لیں کہ یہ امر صرف رسولوں کے ساتھ خاص ہے، پھر بھی اس سے یہ تو ضرور ثابت ہو جاتا ہے کہ اُن کے زمانے میں کفر کوئی مخفی اور ناقابل معلوم شے نہیں تھا، بلکہ اُسے بہ خوبی جان لیا جاتا اور اس کے حاملین پر سزاؤں کا باقاعدہ اِطلاق کر دیا جاتا تھا۔ اس سوال کے جواب میں واضح ہو کہ کفر جان بوجھ کر انکار کر دینے کا نام ہے اور دل کے اس معاملے کی خبر اُن کے زمانے میں بھی ممکن نہیں ہوتی، سوائے اِس ایک صورت کے کہ خدا اپنے پیغمبروں کو اس بارے میں خبر کر دے۔ البتہ، جہاں خدا خبر نہیں کرتا، وہاں ایمان اور کفر کے فیصلے حقیقت حال پر نہیں، ظاہر ہی پر ہوتے ہیں تاکہ مخاطبین کو جزا و سزا کے مرحلے سے بہر حال گزارا جا سکے۔ اس ظاہری امتیاز کے لیے ہوتا یہ ہے کہ کچھ پیمانے مقرر کر دیے جاتے ہیں۔ جیسا کہ مثال کے طور پر، یہ ضروری قرار دے دیا جاتا ہے کہ جو لوگ ایمان کا دعویٰ کریں، وہ اپنے ایمان کی شہادت میں رسول کی امامت میں نماز ادا کریں یا اُس کی طرف سے حکم ہو تو ہجرت کر کے اُس کے پاس آ جائیں یا سب کو چھوڑ کر اُسی کی معیت کو اختیار کر لیں یا اُس کے اشارے پر جان و مال لٹا دینے اور ہر طرح کا اِقدام کرنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ سو اسی طرح کے ظاہری احکام ہوتے ہیں جن کو ماننے والے مومنین اور ان سے روگردانی کرنے والے کافر قرار پا جاتے ہیں[19]، وگرنہ جہاں تک کفر کی

19؎ یہ سب فیصلے چونکہ حقیقت حال پر نہیں، بلکہ ظاہر پر ہوتے ہیں، اس لیے لازم نہیں ہوتا کہ ہر مومن اور کافر دنیا میں اپنے

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

بات ہے تو وہ اُس زمانے میں بھی مخفی اور نا قابل معلوم شے ہی ہوتا ہے۔

جس حدیث میں 'کفر بواح' کے الفاظ آئے ہیں اور اس سے حکمرانوں کی تکفیر اور اُن کے خلاف خروج کرنے پر استدلال کیا گیا ہے، ہماری رائے میں اس سے بھی یہ استدلال کرنا صحیح نہیں ہے۔ اس روایت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیش نظر نہ حکمرانوں کی تکفیر کرنے کے شرائط بتانا ہے اور نہ اُن کے خلاف کسی اِقدام یا خروج کرنے کا جواز بیان کرنا۔ اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف اور صرف اُن کی اطاعت کے حدود بیان فرمائے ہیں۔ قرآن نے جب حکمرانوں کی اطاعت کا تقاضا کیا تو اُن کے بارے میں یہ لازم قرار دیا تھا کہ وہ خود بھی مسلمان ہوں[20]؛ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بیعت لیتے ہوئے یہ صراحت فرمائی کہ لوگ سنیں اور مانیں اور اِقتدار کے معاملے میں اُن سے کوئی جھگڑا نہ کریں، سوائے اِس ایک صورت کے کہ وہ کھلے کفر کا ارتکاب کرنے لگیں اور اس طرح مسلمان ہونے کی حیثیت سے حاصل اپنی اطاعت کے حق سے محروم ہو جائیں۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہاں سرے سے یہ مسئلہ ہی زیر بحث نہیں ہے کہ لوگ کیا اُن کے خلاف خروج کر سکتے اور اس کے لیے اُنھیں کافر قرار دے سکتے ہیں، بلکہ صرف اور صرف اس بات کی وضاحت مقصود ہے کہ وہ اپنے حکمرانوں کی اطاعت کے کب تک پابند ہیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ مثال کے طور پر، ہم کہیں کہ اچھی بیوی کے لیے ضروری ہے کہ وہ گھر کے امور میں اپنے شوہر کی جسے قوام بنایا گیا ہے، فرماں بردار بن کر رہے اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ شوہر کو یہ قوامیت چند وجوہ کی بنا پر دی گئی ہے[21]۔ اب فرض کیجیے کہ اُس کی طرف سے اُن وجوہ کے خلاف کوئی طرز عمل سامنے آئے تو ظاہر سی بات ہے کہ خدا کی طرف سے اُس کی فرماں برداری کا تقاضا بھی آپ سے آپ ختم ہو جائے گا۔ اور تقاضا ہی ختم ہو جائے گا، نہ کہ اس سے یہ لازم آئے گا کہ بیوی آگے بڑھ کر اُس کے خلاف نشوز پر بھی ضرور اُتر آئے۔

ضمناً، ہم یہاں یہ بھی عرض کرنا چاہیں گے کہ اس روایت کی اصل مراد بالکل واضح ہو جاتی اگر اس کی تالیف کے بارے میں ایک بنیادی بات ہمارے سامنے رہتی۔ وہ یہ کہ اس میں 'إلا أن تروا کفرًا بواحًا' کا استثنا 'و أن لا ننازع الأمر أهله' پر نہیں، بلکہ سمع و طاعت کے عہد پر ہے اور 'و أن لا ننازع الأمر أهله' کا جملہ اطاعت ہی کی تاکید مزید کے لیے سلبی طور پر آ گیا ہے، یعنی اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم حکمرانوں سے جھگڑو گے نہیں، سوائے اس

---

حقیقی انجام سے دوچار بھی ہو جائے۔

20 'وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ' میں 'مِنْكُمْ' کے الفاظ اسی بات پر دلالت کرتے ہیں (النساء ۴: ۵۹)۔

21 النساء ۴: ۳۴۔ ہم نے شوہر کی قوامیت، اُس کے وجوہ اور تقاضوں کے متعلق اپنے ایک مضمون میں الگ سے لکھا ہے۔

ایک صورت کے کہ وہ کھلا کفر کریں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ تم اُن کی اطاعت ہی کرو گے اور ہرگز اُن سے جھگڑا نہ کرو گے، البتہ، اُن کی یہ اطاعت اُس وقت تک تم پر لازم رہے گی جب تک وہ کھلے کفر کا ارتکاب نہ کرنے لگیں۔

## ۴۔ متفرق دلائل

۱۔ قرآن میں بیان ہوا ہے کہ اللہ نے عالم ارواح میں آدم علیہ السلام کی اولاد سے یہ عہد لیا: کیا میں تمھارا رب نہیں ہوں؟ سب نے اقرار کیا: ہاں، آپ ہی ہمارے رب ہیں۔ اس سے بعض حضرات نے یہ نکتہ پیدا کیا ہے کہ خدا کے وجود کے معاملے میں ہر انسان پر اِتمام حجت ہو چکا ہے اور اس مقصد کے لیے الگ سے کسی اتمام حجت کی ضرورت نہیں، چنانچہ ملحدین اگر آج خدا کا انکار کریں تو کم سے کم اُنھیں اس عہدِ الست کی بنیاد پر کافر ضرور قرار دیا جا سکتا ہے۔

اس نکتہ کے جواب میں عرض ہے کہ اتمام حجت کے وقوع کے لیے جس طرح یہ ضروری ہے کہ ہدایت کا ابلاغ اور اُس کا وضوح ہو چکا ہو، اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ مخاطب کے پاس اس معاملے میں کوئی عذر نہ رہ گیا ہو۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو عہد الست کی مذکورہ آیتوں میں صرف یہ بیان ہوا ہے کہ ہماری فطرت میں خدا نے اپنی ربوبیت کا علم ودیعت کیا[۲۲] اور ہم سے عالم ارواح میں اس پر عہد بھی لیا ہے اور اس کا مطلب ظاہر ہے کہ یہی ہے کہ اُس کی طرف سے اس سلسلے میں اتمام حجت کر دیا گیا ہے، چنانچہ اب ہم آخرت کے دن یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہماری ہدایت کا کوئی بندوبست نہیں ہوا اور ہم اس باب میں سراسر غافل تھے۔ ان آیات میں یہ بالکل بھی بیان نہیں ہوا کہ یہ اتمام حجت ہم میں سے ہر ایک پر واقع بھی ہو گیا ہے اور اس معاملے میں ہم پر ہمیشہ کے لیے ہر طرح کا قطع عذر بھی کر دیا گیا ہے، چنانچہ اب ہم اُس کے سامنے کوئی عذر پیش کرنے کی پوزیشن میں نہیں رہے۔ سو قطع عذر کے بغیر، یہ سب اتمام حجت کا محض انتظام ہے اور ہمیں معلوم ہے کہ صرف انتظام کی بنیاد پر نہ تو کسی متعین شخص پر اس کے وقوع کا دعویٰ کیا جا سکتا ہے اور نہ اس بنیاد پر اُس کی کسی صورت میں تکفیر ہی کی جا سکتی ہے۔ اس کی بہت اچھی مثال ہمارے خارج میں کیا گیا اتمام حجت کا انتظام ہے۔ اس کے لیے بھی بالکل یہی کیا گیا کہ خدا نے اپنے پیغمبروں کو بھیجا، اُنھوں نے بھی ہدایت کے علم کو لوگوں تک پہنچایا اور اس کے بارے میں اُن سے بار ہا اقرار بھی لیا، جیسا کہ مثال کے طور پر ان سے پوچھا کہ

---

۲۲؎ فطرت میں ودیعت کردہ اس علم سے مراد، اصل میں اس کی وہ مخفی بنیاد ہے جو خارج کے زیر اثر جب ظاہر ہو جاتی تو باقاعدہ علم قرار پا جاتی ہے۔

بتاؤ، زمین اور آسمانوں کا رب کون ہے؟ اُن کی تخلیق کرنے والا اور اُن میں رزق کا انتظام کرنے والا کون ہے؟ اُنھوں نے اقرار کیا کہ یہ وہی پروردگار عالم ہے تو اس پر پیغمبروں نے اُن کے اخروی مواخذے کو بھی تفصیل سے بیان کیا۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ اُن کی طرف سے اتمام حجت کے اس قدر اہتمام کے بعد بھی اس بات کا امکان بہرحال موجود رہا کہ اُن کے مخاطبین میں سے کسی کے پاس اس سلسلے میں کوئی عذر رہ جائے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے ہر مرحلے میں، حتیٰ کہ اُن کی طرف سے براءت کا اعلان ہو جانے کے بعد بھی، نہ صرف یہ کہ اس کے امکان کو تسلیم کیا گیا، بلکہ اس بنیاد پر منکرین کو اُن کے مواخذے میں کچھ مہلت بھی دی گئی[۲۳]۔ غرض یہ ہے کہ آج کسی ملحد کو بھی ہدایت کے ان سارے انتظامات کے باوجود کافر قرار نہیں دیا جا سکتا، اس لیے کہ شاید اس کے پاس بھی اس معاملے میں کوئی ایسا عذر موجود ہو جو خدا کے ہاں قابل التفات اور قال مسموع ٹھیرے اور آخرت میں اس کے لیے کچھ نہ کچھ رعایت کا سبب بن جائے، اور ہم یہ بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ آج کے دنوں میں ہم مسلمانوں کی بے دینی کی وجہ سے ان اعذار کے لاحق ہو جانے کے امکانات رسول اللہ کے زمانے کی نسبت کئی گنا مزید بڑھ بھی گئے ہیں۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ہمارے خیال میں عہد الست کی ان آیات سے اٹھائے گئے استدلال کے نقص کو ہماری یہ معروضات بالکل واضح کر دیتی ہیں، مگر ہم چاہتے ہیں کہ اس کے بارے میں مزید تفصیل بیان کر دیں تاکہ اس سلسلے کے دوسرے سوالات اور اس میں پیدا ہو جانے والی دیگر اُلجھنوں کو حل کرنے کی راہ بھی کچھ آسان ہو جائے۔ اس ذیل میں ہم پہلے دو مقدمات کو بیان کریں گے: ایک یہ کہ عہد الست کے اس واقعہ کی اصل صورت اور اُس کے مضمرات کیا ہیں[۲۴] اور دوسرے یہ کہ ان آیات کا اصل مدعا اور مفہوم کیا ہے۔ اس کے بعد ان سے اخذ ہونے والے کچھ ناگزیر نتائج کو بیان کریں گے:

۱۔ اللہ نے انسان کی روح کا یا دوسرے لفظوں میں اُس کی شخصیت کہہ لیجیے، جس وقت خمیر اٹھایا تو اُس میں اپنے رب ہونے کا علم بھی ساتھ ہی گوندھ دیا۔ اس بات کی واضح دلیل یہ ہے کہ جب عالم ارواح میں اُس نے 'اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ' کہہ کر اپنے بارے میں استفسار کیا تو یہ فطری علم اس سے تحریک پا کر 'بَلٰی شَھِدْنَا' کے اقرار کی صورت میں فوری طور پر ظاہر ہو گیا۔ اگر یہ اُن کی فطرت میں پہلے سے ودیعت نہ کر دیا گیا ہوتا تو اس موقع پر اُس کا ظاہر ہو جانا کسی طرح بھی ممکن نہ ہوتا۔ قرآن بتاتا ہے کہ اللہ نے اپنی ربوبیت کے بارے میں یہ سوال اس لیے کیا تاکہ اُن کی طرف

---

۲۳؎ التوبہ ۹: ۶۔

۲۴؎ یہ سارا واقعہ سورۂ اعراف کی آیات ۱۷۳ اور ۱۷۴ میں بیان ہوا ہے۔

سے اقرار ہو جانے پر اُن کے خلاف شہادت قائم ہو جائے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ شہادت اصل میں اُسی فطری علم کی تاکید کے لیے تھی اور اس کا مقصد یہی تھا کہ بنی آدم پر اُن کے اپنے علم کی روشنی میں حجت تمام کر دی جائے۔ بہرحال، اس کے بعد خدا کی اسکیم یہ ہوئی کہ اولادِ آدم کا امتحان اُس دنیا کے بجاے اِس دنیا میں لیا جائے اور اس کے لیے اُنھیں ایک مادی پیکر اور کچھ اِرادہ و اِختیار دے کر یہاں اتار دیا جائے۔ چنانچہ اس کے لیے ایک تو یہ ہوا کہ مذکورہ قول و قرار اُن کی یاداشت سے بالکل محو کر دیا گیا اور دوسرا یہ ہوا کہ اس عہد کے زیر اثر جو اُن کا فطری علم ظاہر ہو گیا تھا، وہ دوبارہ سے پردۂ اِخفا میں چلا گیا۔ ان میں سے پہلی بات کے ثبوت کے لیے کسی دلیل کی ضرورت نہیں، ہم جانتے ہیں کہ آج کسی بھی ابن آدم کو یہ قول و قرار یاد نہیں۔ دوسری بات کی دلیل ہمارے مشاہدے کے ساتھ ساتھ قرآن میں بھی موجود ہے جہاں اِس دنیا میں پیدایش کے وقت انسان کے علم کی حالت بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے: 'لَا تَعۡلَمُوۡنَ شَیۡئًا' کہ اُس وقت تم کچھ نہیں جانتے ہوتے[۲۵]۔ اب اس دنیا میں امتحان کی غرض سے یہ بے حد ضروری تھا کہ اُس کا یہی علم دوبارہ سے ظہور کرے اور اُس کے شعور کا باقاعدہ طور پر حصہ بنے۔ لیکن اس مرتبہ خدا کی طرف سے براہ راست مکالمہ نہیں ہوا، بلکہ اس کے لیے ایک طرف اُسے سمع و بصر اور عقل و فکر کی صلاحیتیں دے دی گئیں اور دوسری طرف اُس کے خارج میں خدا تک پہنچانے والی بہت سی نشانیاں بکھیر دی گئیں اور مزید یہ ہوا کہ حضرتِ آدم علیہ السلام سے نبوت کا ایک طویل سلسلہ بھی شروع کر دیا گیا۔ اب ہوتا یوں ہے کہ ان صلاحیتوں اور خارج کے زیر اثر جس شخص کا فطری علم اس دنیا میں ظہور کر جاتا ہے، اُس پر اس معاملے میں اِتمام حجت بھی واقع ہو جاتا ہے۔ اور جس شخص پر یہ ظاہر نہیں ہو پاتا اور حالت اِخفا ہی میں رہ جاتا ہے، اُس پر اتمام حجت بھی واقع نہیں ہو پاتا۔

۲۔ ان آیات کے بارے میں ایک تو یہ بات واضح رہے کہ ان میں اِلحاد یا خدا کے ہونے یا نہ ہونے کا کوئی مسئلہ اصلاً زیر بحث نہیں ہے۔ بلکہ ان میں خدا کے رب ہونے اور اس کے تقاضے سے شرک کے غلط ہونے پر خبردار کیا گیا ہے۔ دوسری بات یہ کہ ان میں 'اَنۡ تَقُوۡلُوۡا یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ' کا جملہ صرف 'وَ اَشۡہَدَہُمۡ عَلٰۤی اَنۡفُسِہِمۡ' سے متعلق نہیں ہے، بلکہ ربوبیت کے فطری علم اور اس کے بارے میں لیے گئے قول و قرار پر مبنی سارے انتظام سے متعلق ہے۔ یعنی اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ اقرار ہم نے بنی آدم سے اس لیے لیا ہے کہ وہ قیامت کے دن کوئی عذر نہ پیش کر سکیں، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس فطری علم کو ودیعت کر کے اور اس پر تمھارا اقرار لے کر جو ہم نے یہ سارا انتظام کیا ہے تو اس کا مقصد یہی تھا کہ تمھیں اس بارے میں علم دیا جائے اور غفلت کے اندھیروں میں بھٹکنے کے لیے

---

۲۵؎ النحل ۱۶: ۷۸۔

نہ چھوڑ دیا جائے کہ کل قیامت کے روز تم اس چیز کو عذر بناؤ کہ ہماری ہدایت کا کوئی انتظام نہ کیا گیا تھا۔ تیسری بات یہ کہ 'اَنۡ تَقُوۡلُوۡا' میں موجود ضمیر خطاب، تمام بنی آدم کے لیے نہیں، جیسا کہ عام طور پر بیان کیا گیا ہے، بلکہ یہ صرف ان آیات کے براہ راست مخاطبین، یعنی قریش کے لیے آئی ہے۔ دوسرے لفظوں میں، یہاں یہ بیان نہیں ہوا کہ خدا نے بنی آدم سے عہد لیا تو اس موقع پر انھی سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ قول وقرار میں نے اس لیے لیا ہے تاکہ تم روز قیامت میرے سامنے اپنی غفلت کا عذر نہ پیش کر سکو۔ بلکہ اصل بات یہ ہے کہ قریش کے لوگوں کو عالم ارواح میں ہونے والے قول وقرار کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا ہے کہ یہ سب انتظام ہم نے اسی لیے تو کیا تھا کہ تم قیامت میں یہ عذر نہ کر سکو کہ ہمیں خدا کی ربوبیت کا کچھ علم نہ تھا، چنانچہ ہم اپنے ماحول سے متاثر ہوئے اور شرک کی غلاظتوں میں جا پڑے۔ ضمیر خطاب کی اس تعیین کی وجہ یہ ہے کہ یہ آیتیں سورۂ اعراف کی ہیں جو ایک مکی سورہ ہے، اور اس کے متعلق ہم جانتے ہیں کہ اس میں اصلاً قریش ہی کے ساتھ خطاب ہوا ہے، اور اس میں شرک پر انذار کرتے ہوئے قرآن کے عام طریقہ کے مطابق عقل وفطرت، آفاق اور انفس کے حقائق کو بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ مذکورہ آیتوں میں اسی غرض سے بنی آدم کے نفس میں موجود علم اور اس پر لیے ہوئے اقرار کو پیش کیا ہے۔ اس کے بعد قریش ہی سے جو اِس انذار کے اصل مخاطب ہیں، فرمایا ہے کہ یہ سب انتظام ہم نے اس لیے کیا ہے کہ تم قیامت کے روز یہ عذر نہ پیش کرنا کہ ہم خدا کے رب ہونے کا علم نہیں رکھتے تھے، اس لیے شرک میں ملوث ہو گئے یا ہمارے باپ دادا شرک کرتے تھے، اس لیے ان کے زیر اثر ہم بھی یہی کچھ کرتے رہے۔ یہ آخری جملہ بھی دیکھ لیجیے کہ عالم ارواح میں موجود سب بنی آدم کے بجاے، اس دنیا میں آ جانے والے قریش ہی کی طرف سے موزوں ہو سکتا ہے کہ جن کے باپ دادا واقعہ میں شرک کرتے رہے تھے۔

اب ان دو مقدمات سے اخذ ہونے والے چند نتائج کو ہم ذیل میں بیان کرتے ہیں کہ جن سے کسی صورت بھی مفر نہیں ہے:

ایک یہ کہ اس واقعہ کا قرآن مجید میں مذکور ہونا اور اس کی اطلاع کسی شخص تک پہنچ جانا، یہ اپنی ذات میں اِتمام حجت کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ یہ اگر اس میں بیان نہ بھی ہوتا اور اس کی اطلاع بھی کسی شخص تک نہ پہنچ پاتی، تب بھی زیر بحث مسئلہ میں اس سے کوئی فرق نہ پڑتا۔ اس لیے کہ اِتمام حجت میں اصل حیثیت اس واقعہ کی نہیں، بلکہ انسان کو دیے گئے فطری علم کی ہے جو اس سے پہلے ہی اُسے ودیعت کر دیا گیا تھا اور اس موقع پر ہونے والے قول وقرار میں محض اس کا ظہور ہوا تھا۔ چنانچہ محض قرآن کی ان آیات کو پڑھ کر کسی شخص کی تکفیر کر دینا، کسی طرح بھی روا نہیں ہے۔

دوسرے یہ کہ اس فطری علم کی بھی یہ حیثیت نہیں ہے کہ محض اس کے فطرت میں موجود ہونے پر اتمام حجت کا دعویٰ اور پھر اسی بنیاد پر کسی شخص کی تکفیر کر دی جائے، بلکہ ضروری ہے کہ یہ اُس کے سامنے اُسی طرح ظہور کرے، جیسے عالم ارواح میں ایک سوال کے جواب میں اس نے ظہور کیا تھا کہ علم کا ابلاغ اور اُس کا وضوح، یہ دونوں ہی اتمام حجت کے لازمی شرائط ہیں۔ اس بات کو سمجھنے کے لیے قرآن ہی کی ایک مثال دیکھ لی جا سکتی ہے۔ فرمایا ہے کہ ہم نے انسان کے نفس میں نیکی اور بدی کا الہام کر دیا ہے۔[26] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر بچہ نیکی اور بدی کی فطرت لے کر اس دنیا میں آتا ہے، مگر ہم جانتے ہیں کہ وہ اپنی اس فطرت کے بارے میں بالکل بھی آگاہ نہیں ہوتا۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ہم نیکی اور بدی کے معاملے میں بچوں کو محض فطرت کی بنیاد پر کبھی مسئول نہیں ٹھیراتے، بلکہ ہمیشہ یہ دیکھنا ضروری سمجھتے ہیں کہ اُن کی یہ فطرت کیا اپنی خوابیدگی کو ختم کر کے اُن کا علم اور شعور بھی بن چکی ہے۔

تیسرے یہ کہ عہد الست کے واقعہ میں ہونے والے اس علم کے ظہور سے بھی کسی شخص کی تکفیر کرنے پر استدلال نہیں کیا جا سکتا۔ یہ سب اس دنیا میں آنے سے بہت پہلے عالم ارواح میں وقوع پذیر ہوا اور ہم جانتے ہیں کہ یہاں اتر آنے کے بعد ہمارے شعور اور اُس علم کا تعلق اب ویسا نہیں رہا۔ وہ ہمارے شعور سے نکل کر حالت اخفا میں، گویا کہ لاشعور میں چلا گیا، حتیٰ کہ اُس کے بارے میں ہونے والے قول وقرار کو بھی ہماری یادداشت سے یک سر مٹا دیا گیا۔ لہٰذا، جو شخص آج کسی منکرِ خدا کی تکفیر پر اصرار کرتا ہے، اُس پر لازم ہے کہ وہ پہلے اس بات کو ثابت کرے کہ انسان جب اس دنیا میں آتا ہے تو اُس پر یہ ظہور اسی طرح مسلسل قائم ہوتا ہے اور اُسے اللہ کے رب ہونے کا نہ صرف یہ کہ فطری طور پر، بلکہ شعوری طور پر بھی مکمل علم ہوتا ہے۔ وگرنہ یہ بات سراسر ظلم ہوگی کہ محض اس وجہ سے کسی شخص کی تکفیر کر دی جائے کہ زمانہ قبل از دنیا میں اور اُس کی پیدایش سے بھی بہت پہلے یہ سب ایک مرتبہ اُس پر ظاہر ہوا تھا۔

چوتھے یہ کہ اس بات کو فرض کر لینا بھی صحیح نہیں ہے کہ یہ فطری علم اس دنیا میں آنے والے ہر شخص پر لازماً ظاہر ہو کر رہتا ہے، اس لیے بلا تامل ہر منکر کی اس باب میں تکفیر بھی کی جا سکتی ہے۔ اس بات میں تو کوئی شک نہیں کہ اس کے لیے خدا نے جس قدر اہتمام کیا ہے، عام طور پر یہ ظاہر ہو کر رہتا ہے، مگر اس میں، بہرحال، یہ استثنا بھی موجود ہے کہ کسی شخص میں یہ زندگی بھر مستور رہے اور کسی صورت بے حجاب نہ ہونے پائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا میں جس طرح بہت سے ایسے محرکات پائے جاتے ہیں جو فطری علوم کو تحریک دیتے ہیں، اسی طرح یہاں کئی ایسے موانع بھی موجود ہیں جو بعض اوقات ان کے ظہور میں رکاوٹ بن جایا کرتے ہیں۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کوئی بچہ

۲۶۔ الشمس ۹۱: ۷-۸۔

بولنے کی صلاحیت لے کر پیدا ہو، مگر سماعت سے یک سر محروم ہو اور اس کے نتیجے میں وہ بولنے سے بھی محروم رہ جائے۔ یا وہ صحیح سالم پیدا ہو، مگر اُس کے ماحول میں سبھی گونگے پائے جاتے ہوں اور یوں بات کرنے کی اُس کی ساری صلاحیتیں دبی کی دبی رہ جائیں۔

پانچویں یہ کہ اس دنیا میں ہمارے فطری علم اور ہمارے شعور کے تعلق کو دوبارہ سے قائم ہونا اور یوں اس علم کو پھر سے ظہور کرنا ہے۔ اس میں یہ امکان کسی صورت بھی رد نہیں کیا جا سکتا کہ کسی شخص میں اس علم کے ظہور اور اس کے اقرار اور اس کے تقاضوں کو پورا کرنے میں کچھ اعذار لاحق ہو جائیں۔ یہ اعذار، جیسا کہ پیچھے تفصیل گزری، ہر انسان کو اس دنیا میں کسی بھی وقت لاحق ہو سکتے اور اس کے مواخذے میں کچھ نہ کچھ رعایت کا سبب بن سکتے ہیں، اور فطری علوم کے ظہور میں ان کا لاحق ہو جانا، خارجی علوم کے مقابلے میں زیادہ قرین قیاس بھی ہے۔ سو اعذار کے اِس امکان کے ہوتے ہوئے ہمارے لیے بالکل بھی روا نہیں ہے کہ ہم کسی متعین شخص پر چاہے وہ ملحد ہی کیوں نہ ہو، اتمام حجت کے واقع ہو جانے اور پھر اسی بنیاد پر اس کی تکفیر کرنے پر اصرار کریں اور بالخصوص اس صورت میں کہ جب ہماری معلومات کا عالم یہ ہو کہ ہم کسی کے حقیقی عذر کو نہ خود جان سکتے ہوں اور نہ مذکورہ آیات ہمیں اس طرح کی کوئی اطلاع ہی دیتی ہوں۔

چھٹے یہ کہ 'اَنْ تَقُوْلُوْا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ . . .' کے جملوں سے اگر کوئی شخص اعذار کے مطلق ختم ہو جانے پر استدلال کرتا ہے تو اسے چاہیے کہ وہ یہ استدلال تمام بنی آدم کے بجاے صرف قریش کے بارے میں کرے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں اصل خطاب قریش ہی کے لوگوں سے کیا گیا ہے اور اُن کے متعلق یہ بھی ایک واقعہ کا بیان ہے کہ ربوبیت کا یہ فطری علم اُن کے سامنے بالکل واضح تھا اور وہ اس کا اقرار کرتے اور اپنے عقیدہ و عمل میں اس کا برملا اظہار بھی کرتے تھے، جیسا کہ خود قرآن نے اس کی وضاحت فرمائی ہے۔ تاہم اس کے باوجود، اگر کوئی شخص ضمیر خطاب کی اس تعیین کو نہ مانے اور اسے ملحدین سمیت سب بنی آدم سے متعلق سمجھ لے تو پھر بھی اُن میں سے کسی شخص کو کافر اور سزاوارِ عذاب اُسی صورت میں قرار دیا جا سکتا ہے کہ جب ہم پہلے یہ بات ثابت کریں کہ اللہ کی ربوبیت کا علم جو فطرت کے دوسرے حقائق کی طرح پوشیدہ ہوتا ہے، اُس پر ایک مرتبہ پوری طرح سے واضح ہو چکا ہے[۲۷]، اور وہ آخرت میں اب یہ کہنے کی پوزیشن میں بالکل نہیں رہا کہ اے اللہ، میں تو اس بات سے سراسر غافل تھا، کیونکہ 'اِنَّا کُنَّا عَنْ ھٰذَا غٰفِلِیْنَ' کے الفاظ تو پھر یہی بتاتے ہیں کہ آخرت میں مواخذہ اُسی شخص کا ہوگا جو خدا کے حضور اپنی لاعلمی اور جہالت کا عذر نہ

---

۲۷؎ یاد رہے، یہ علم ایک مرتبہ اُن پر ظاہر ہو جاتا ہے اور وہ کسی بے جا حجاب کے زیر اثر پھر اُس سے غافل ہو جاتے ہیں تو اب وہ خدا کے حضور کم سے کم غفلت یعنی، لاعلمی کا عذر پیش نہ کر سکیں گے۔

پیش کر سکے گا۔

ساتویں یہ کہ ان آیات میں خدا کے موجود ہونے یا نہ ہونے کا کوئی مسئلہ، اصلاً زیر بحث نہیں ہے، بلکہ ان میں خدا کی ربوبیت کی بنیاد پر قریش کے لوگوں کو شرک کے معاملے میں انذار کیا گیا ہے۔ یعنی، خدا کی ربوبیت کا علم چونکہ انسان کی فطرت میں ودیعت ہے، اس لیے اس تقاضے سے شرک میں مبتلا اُن لوگوں سے کہا گیا ہے کہ وہ انجانے میں یا غفلت کے کسی اندھیرے میں نہیں، بلکہ حقائق کو جاننے کے بعد اور پوری روشنی میں یہ شرک کر رہے ہیں، اس لیے وہ اپنے اس شرک میں قیامت کے دن قطعاً معذور نہیں ہوں گے۔ چنانچہ یہ آیات تبعاً تو کسی شخص کے اِلحاد و انکار سے متعلق کی جا سکتی ہیں، مگر یہ اس سے براہ راست کوئی تعلق رکھتی ہیں اور نہ اس بنیاد پر اس کے اخروی مواخذے کی بات ہی کرتی ہیں۔ لہٰذا، محض ان آیات کو پڑھ کر ملحدین سمیت سب بنی آدم کے لیے قطع عذر اور اس بنیاد پر ان کی تکفیر پر استدلال کرنا، ان آیات کے اصل مفہوم سے صریح طور پر تجاوز ہے۔

۲۔ سیدنا صدیق رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں مرتدین کے ساتھ جو قتال کیا گیا، اُس سے بھی مجوزین تکفیر نے دلیل اخذ کی ہے کہ صحابہ کی جماعت کی طرف سے اُنھیں مرتدین قرار دے دینا، اصل میں اُن کی تکفیر کرنا ہی تھا۔ اُس زمانے کے مخصوص حالات اور ارتداد کے موقع پر کی گئی خلیفۂ رسول کی گفتگو اگر سامنے رکھی جائے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ صحابہ کے اس اِقدام کا بھی تکفیر کی بحث سے کوئی تعلق نہیں۔

سورۂ توبہ میں اُن مشرکین کے لیے جن پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اتمام حجت ہو چکا تھا، ایک خدائی عذاب کا اعلان ہوا ہے۔ فرمایا ہے کہ اس طرح کے تمام لوگوں کو ایک مخصوص مدت کے گزر جانے کے بعد قتل کر دیا جائے، یہاں تک کہ وہ اپنے کفر سے باز آ جائیں اور اسلام کو قبول کر لیں اور اس کی شہادت میں نماز اور زکوٰۃ کا اہتمام کریں۔ اس عذاب سے بچنے کی عملی صورت یہ ہوئی کہ اُنھوں نے کفر و شرک سے تائب ہونے اور اسلام کو قبول کرنے کا اعلان کر دیا اور چونکہ اُس وقت مدینے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی حکومت قائم تھی، اس لیے یہ بھی اقرار کیا کہ وہ اپنی زکوٰۃ اسی حکومت کو ادا کریں گے۔ اُن سمیت سب پر یہ بات بھی بالکل واضح تھی کہ وہ اپنے جیتے جی اس عہد پر کاربند رہیں گے کہ اُن پر ہونے والا اتمام حجت اور اُس کے نتائج کچھ مدت کے لیے نہیں، بلکہ زندگی بھر کے لیے تھے۔ اس کے بعد جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو گئی تو اس عہد کی رو سے اُن پر لازم تھا کہ وہ ایمان پر قائم رہیں، نماز ادا کرتے رہیں اور اپنی زکوٰۃ اب اُس نظم اجتماعی کو ادا کریں جسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خلافت بالاتفاق منتقل ہو چکی تھی۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ایسا نہیں ہوا اور بہت سے لوگوں نے اپنا عہد توڑ دیا۔ بعض

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

نے نبوت کے جھوٹے دعوے داروں کو نبی مان لیا اور بعضوں نے یہ کیا کہ مرکز خلافت کو زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا اور اس طرح یہ دونوں گروہ مسلمانوں کے نزدیک مرتدین اور دوبارہ سے خدائی عذاب کے مستحق قرار پا گئے۔ صحابہ کے اس فیصلے میں یہ اس عہد کی مرکزی حیثیت ہی تھی کہ بعض لوگوں نے جب یہ کہا کہ وہ ایمان پر قائم رہیں گے اور نماز و زکوٰۃ کا بھی اہتمام کریں گے، مگر اپنی زکوٰۃ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مرکز خلافت کو ادا نہیں کریں گے تو اُنھیں بھی مرتد قرار دے کر اُن سے قتال کرنے کا فیصلہ کیا گیا اور اس موقع پر سیدنا ابوبکر نے یہی وضاحت فرمائی: 'و اللّٰہ لو منعوني من الزكاة عقالًا مما كان ياخذ منهم النبي صلى اللّٰه عليه و سلم لقاتلتهم عليه أبدًا'[۲۸]۔ کہ یہ لوگ اللہ کے رسول کو جو زکوٰۃ دیا کرتے تھے، اگر اُس میں سے ایک جانور بھی روک لیں گے تو میں اس پر اُن سے ضرور قتال کروں گا۔ اس تفصیل سے غرض یہ ہے کہ صحابۂ کرام نے اُن سے قتال محض اس لیے نہیں کیا کہ وہ لوگ اسلام اور اُس کے احکام چھوڑ کر مرتد ہو گئے تھے، بلکہ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ وہ اپنی عہد شکنی سے اُس امان سے محروم ہو گئے تھے جو خدا کے عذاب کے مقابلے میں اُنھیں حاصل ہوئی تھی اور اس طرح وہ اپنی موجودہ حیثیت سے محروم ہو کر پہلی حیثیت میں آ گئے اور دوبارہ سے خدا کے عذاب کے حق دار ٹھیرا دیے گئے تھے۔ سو یہ اُس معنی میں کسی کو کافر قرار دے دینا نہیں تھا جس معنی میں ہم یہاں بحث کر رہے ہیں، بلکہ یہ اُن لوگوں کو دوبارہ سے کافر قرار دے دینا تھا جو پہلے بھی کافر ہی تھے، مگر رسول اللہ کی طرف سے اتمام حجت ہو جانے کے بعد ایک عہد کے نتیجہ میں مسلمان قرار پا گئے تھے۔

جہاں تک خوارج سے قتال کرنے کا معاملہ ہے تو اس میں تکفیر کا سرے سے کوئی مسئلہ ہی پیدا نہیں ہوا کہ اس سے تکفیر پر استدلال لایا جا سکے۔ یہ مسلمانوں میں سے وہ حضرات تھے جو سب سے بڑھ کر اسلام کے دعوے دار اور نماز روزے کا نہایت سختی سے التزام کرنے والے تھے، مگر ان کے فہم کی کجی تھی کہ حضرت علی کے خلاف خروج کر بیٹھے تھے۔ چنانچہ اُن سے قتال اُنھیں مرتد یا کافر قرار دے کر نہیں، بلکہ مسلمان سمجھتے ہوئے کیا گیا۔ اور یہی وجہ تھی کہ مرتدین کے برعکس، مرنے والوں کے جنازے پڑھے گئے، اُن کی عورتیں اور بچے غلام نہیں بنائے گئے، بلکہ جب تک وہ عملی اِقدام سے دور رہے، اُن سے کسی قسم کا تعرض بھی نہیں کیا گیا۔

۳۔ باقی جو یہ کہا گیا ہے کہ جو لوگ ہمیں کافر قرار دیں، اُنھیں محض اسی وجہ سے کافر قرار دیا جا سکتا ہے، یہ بات کسی طرح بھی کوئی علمی دلیل نہیں ہے۔ تکفیر اس لیے نہیں کی جاتی کہ کوئی ہماری تکفیر کر رہا ہے، بلکہ اس کے کچھ بنیادی شرائط ہیں کہ جن کا پورا ہونا از حد ضروری ہے اور ہم جانتے ہیں کہ کم سے کم دوسروں کی تکفیر کرنا اس کی کوئی شرط نہیں

---

۲۸؎ کتاب الردۃ، واقدی ۵۲۔

ہے۔ بلکہ اس دلیل کی اگر حقیقت دیکھی جائے تو یہ گالی کے جواب میں گالی دے دینا ہے اور کچھ نہیں۔ جہاں تک اُن لوگوں کا معاملہ ہے جو اِسلام کا انکار کریں اور خود اپنے آپ کو کافر کہیں، انھیں کافر ضرور کہا جا سکتا ہے، مگر یاد رہے یہ حقیقت میں انھیں کافر کہنا نہیں ہے، بلکہ یہ ایک نام ہے جو اُنھوں نے خود اپنے لیے رکھ چھوڑا ہے۔ آخر بہت سے لوگ اوٹ پٹانگ نام رکھ ہی لیا کرتے ہیں۔

## تکفیر کی ضرورت

غامدی صاحب کے نزدیک تکفیر ایک ناجائز امر ہے، اس لیے کہ اسے جائز قرار دینے کے لیے کوئی دلیل چاہیے اور وہ دلیل، جیسا کہ پیچھے تفصیل گزری، موجود نہیں ہے۔ اسی طرح وہ سمجھتے ہیں کہ تکفیر کی ہمیں کوئی ضرورت بھی نہیں ہے، اس لیے کہ دین اسلام میں کوئی حکم ایسا نہیں دیا گیا کہ جس پر عمل کرنا تکفیر پر موقوف ہو۔ ان کے مقابلے میں جو لوگ اس کے قائل ہیں، اُن کا کہنا ہے کہ دین میں کچھ ضرورتیں ضرور ایسی پائی جاتی ہیں جو ہم سے لوگوں کی تکفیر کا شدت سے تقاضا کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر، وہ کہتے ہیں:

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

۱۔ دین میں ارتداد کی سزا موت ہے اور مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہم پر لازم ہے کہ ہم ان سزاؤں کا نفاذ کریں۔ ظاہر ہے، کسی شخص پر اِس سزا کا نفاذ اُسی صورت میں ممکن ہو سکتا ہے جب اُس کے بارے میں یہ فیصلہ کر لیا جائے کہ وہ اسلام کو چھوڑ کر اب کافر ہو چکا ہے۔

۲۔ مال وراثت اور اُس کی تقسیم، آئے روز پیش آنے والا ایک قضیہ ہے اور حدیث میں ہے کہ مسلمان اور کافر ایک دوسرے کے وارث نہیں ہو سکتے[۲۹]۔ سو اس حکم پر عمل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم میّت کے مسلمان اور کافر ہونے کے بارے میں کوئی نہ کوئی رائے ضرور قائم کریں۔

۳۔ دین اسلام کی یہ تعلیم ہے کہ مسلمان اور کافر کے درمیان میں حمایت و نصرت کا کوئی تعلق قائم نہیں ہو سکتا۔ ایک مسلمان ہی دوسرے مسلمان کا ولی ہو سکتا اور مسلمان ریاست ایک مسلمان ہی کے حقوق کی ضامن ہو سکتی ہے۔ چنانچہ ہم پر یہ لازم ہو جاتا ہے کہ ولایت کے اس تعلق کی رعایت سے ہم اپنے معاشرے کے افراد کو مسلمان اور کافر میں تقسیم کریں۔

---

۲۹؎ بخاری، رقم ۶۷۶۴۔

۴۔اسی طرح نکاح وطلاق کے معاملات ہیں کہ جن میں ہمارے لیے یہ جاننا بے حد ضروری ہوتا ہے کہ کون مسلمان ہے اور کون کافر، اس لیے کہ کفر کی بنیاد پر بعض نکاح ہمارے لیے ممنوع قرار دے دیے گئے ہیں۔ یہی صورت حال نماز جنازہ اور دعا کی ہے کہ ہمیں کافروں کے لیے ان امور کا اہتمام کرنے سے سختی سے روک دیا گیا ہے۔

## دلائل کا تجزیہ

ہم ان دلائل کی حقیقت پر اپنی گزارشات ذیل میں پیش کرتے ہیں:

۱۔ارتداد کے بارے میں ایک بات تو یہ سامنے رہنی چاہیے کہ یہ اپنی ذات میں صریح کفر ہے اور کسی کو مرتد قرار دینا اصل میں اُس کی تکفیر کر دینا ہے۔ چنانچہ اگر تکفیر ایک ناجائز امر ہے جیسا کہ اس پر سیر حاصل گفتگو ہو چکی، تو کسی شخص کو اس معنی میں مرتد قرار دے دینا کہ وہ اب کافر ہو چکا ہے، یہ بھی آپ سے آپ ایک ناجائز امر ہے۔[۳۰] دوسرے یہ کہ غامدی صاحب کے مطابق شریعت میں اِرتداد کی کوئی سزا سرے سے مقرر ہی نہیں ہے کہ اس کے لیے کسی کی تکفیر کرنے کی ضرورت پڑے۔ ارتداد، شرک اور کفر کی طرح خدا کی جناب میں کیا جانے والا ایک جرم ہے اور کسی شخص پر متعین طور پر اس کا اطلاق اور اس کی سزا دینے کا حق بھی صرف اُسے حاصل ہے، اور ہم جانتے ہیں کہ اس حق کا استعمال وہ بالعموم آخرت کے دن پر اٹھا رکھتا ہے۔ جہاں تک قرآن کی اُن آیات کا معاملہ ہے جو ارتداد پر اسی دنیا میں سزا دینے کی بات کرتی ہیں تو غامدی صاحب کے نزدیک وہ آیتیں خدا کی اُس سنت کا بیان ہیں جس کے مطابق وہ اپنے اس حق کا استعمال گاہے گاہے اپنے رسولوں کو بھیج کر اس دنیا میں بھی کرتا رہا ہے۔ چنانچہ کسی شخص کو مرتد قرار دینے کا کام نہ تو شریعت کا کوئی مستقل حکم ہے نہ خدا ہم سے اس کا تقاضا ہی کرتا ہے کہ ہم اسے شرعی ضرورت کا نام دیں اور لوگوں کی تکفیر کرنے لگیں۔

۲۔قرآن میں وراثت کا قانون بیان کرتے ہوئے بیان کیا گیا ہے کہ 'لَا تَدۡرُوۡنَ اَیُّهُمۡ اَقۡرَبُ لَکُمۡ نَفۡعًا، فَرِیۡضَةً مِّنَ اللّٰهِ'۔[۳۱] اس سے دو باتیں بالکل واضح ہو جاتی ہیں: اول یہ کہ وراثت کے مال میں یہ حصے خود اللہ نے مقرر کر دیے ہیں، دوم یہ کہ حصوں کی یہ تقسیم اُس نے اسلام اور کفر کی بنیاد پر نہیں، بلکہ میّت کے رشتوں میں پائی جانے والی

---

۳۰؎ تاہم، جو شخص اسلام کو چھوڑ دے اور اس کا اظہار بھی کرے تو ہم اِس معنی میں اُسے مرتد ضرور کہہ سکتے ہیں کہ وہ اب مسلمان نہیں رہا۔

۳۱؎ النساء ۴: ۱۱۔ ''تم نہیں جانتے کہ ان میں سے کون بہ لحاظ منفعت تم سے قریب تر ہے۔ یہ حصے اللہ نے مقرر کر دیے ہیں۔''

منفعت کی بنیاد پر کی ہے۔ چنانچہ اس قانون کے بعد اب کسی مسلمان کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اس کے مقابلے میں کوئی دوسرا قانون وضع کرے یا اس میں بیان کردہ حصوں میں کوئی کمی بیشی کرے یا منفعت کے علاوہ کسی اور بنیاد پر ان حصوں کو ساقط کر دے۔ اس ذیل میں جو حدیث نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کی جاتی ہے، غور کیا جائے تو وہ بھی اسلام اور کفر کے بجاے منفعت کے اسی اصول پر مبنی ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب رسول دعوت کے ایک خاص مرحلے میں اپنے منکرین سے اعلان براءت کرتے ہیں تو اس کا ایک لازمی تقاضا یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ اور اُسے ماننے والے ان منکرین سے معاشرتی طور پر قطع تعلق کر لیں۔ یہ مقاطعہ بعض اوقات رحمی اور مصاہری رشتوں میں بھی واقع ہو جاتا ہے جب ماں باپ، بہن بھائی اور میاں بیوی میں سے کوئی ایک اسلام قبول کر لیتا اور دوسرا اپنے کفر ہی پر اڑا رہ جاتا ہے اور جس کا ناگزیر نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ان رشتوں میں پائی جانے والی منفعت یک سر ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔ حالات کا یہی تناظر تھا جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ اب مسلمان اور کافر ایک دوسرے کے وارث نہیں ہو سکیں گے۔ سو یہ حدیث وراثت کے قانون میں کسی استثنا کو بیان نہیں کر رہی کہ کوئی منفعت کے بجاے اسلام اور کفر کو اصل قرار دے اور پھر اس بنیاد پر تکفیر کی ضرورت کا نکتہ پیدا کرے، بلکہ یہ اُس قانون میں بیان کردہ علت کے منفک ہونے پر اُس حکم کے ساقط ہو جانے کو بیان کر رہی ہے اور بس۔

۳۔ مسلمان ایک دوسرے کے حامی و ناصر یعنی ولی قرار دیے گئے ہیں۔ کسی مسلمان کے لیے ولایت کا یہ حق دو طرح سے قائم ہوتا ہے: ایک اس طرح سے کہ وہ اسلام کو مانتا اور اپنے آپ کو مسلمان کہلاتا ہو اور دوسرے اس طرح سے کہ وہ کسی مسلمان ریاست کے حدود اور اس کی عمل داری میں ایک مسلمان شہری کے طور پر رہتا ہو۔ اب فرض کیجیے کہ وہ اپنے اسلام سے انکار کر دیتا اور غیر مسلم ہو جاتا ہے تو ظاہر سی بات ہے کہ وہ پہلی قسم کے حق سے محروم ہو جائے گا اور اگر وہ مسلمان ہونے کے باوجود مسلمان ریاست کے حدود میں نہیں آتا اور اس کی عمل داری سے بالکل دور رہتا ہے تو وہ دوسری قسم کے حقوق سے محروم رہ جائے گا۔[۳۲] پہلی صورت میں ہمارے لیے صرف یہ ضروری ہوتا ہے کہ اُس کا مسلمان ہونا معلوم کر لیا جائے اور دوسری میں یہ ضروری ہوتا ہے کہ دیکھ لیا جائے کہ وہ مسلمان ریاست اور اس کی عملداری میں ایک مسلمان شہری کے طور پر رہ رہا ہے یا نہیں۔ لیکن ان دونوں صورتوں میں ہمیں کہیں بھی یہ ضرورت لاحق نہیں ہوتی کہ ہم اُس شخص کو کافر قرار دیں، بلکہ اُس کا غیر مسلم اور غیر شہری ہونا ہی ہمیں ہر طرح سے

---

۳۲؎ قرآن نے اسے صراحت سے بیان بھی کر دیا ہے (الانفال ۸: ۷۲)۔ حدیث میں منقول ابوبصیر کا واقعہ بھی اسی بات کی دلیل ہے (بخاری، رقم ۲۷۳۱)۔

کفایت کر جاتا ہے۔

۴۔ جہاں تک نکاح وغیرہ کے معاملات ہیں تو ان میں بھی کسی کی تکفیر کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہوتی۔ قرآن حکیم میں اُن مرد وعورت سے نکاح کرنا ممنوع قرار دیا گیا ہے جو مشرک ہوں[۳۳]۔ گویا نکاح کی ممانعت میں اصل عامل اسلام اور کفر نہیں، بلکہ شرک ہے۔ اسلام اور کفر کے عامل نہ ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ اس کے باوجود کہ اہل کتاب غیر مسلم اور اپنے کفر پر مصر تھے، اُن کی عورتوں سے نکاح کرنے کی اجازت دے دی گئی۔ اور شرک ہی کے اصل عامل ہونے کی ایک دلیل یہ ہے کہ مسلمانوں کو یہ اجازت اس لیے دی گئی کہ اُن عورتوں کا شرک بہرحال مشرکین جیسا نہیں تھا کہ وہ شرک کو عقیدے کے طور پر نہیں، بلکہ خطا اور غلطی سے اپنائے ہوئے تھیں[۳۴]۔ سو نکاح کے وقت ہمارے لیے یہ جاننا تو بے شک ضروری ہوتا ہے کہ وہ مرد وعورت کہیں شرک میں ملوث تو نہیں اور یہ سب اُن کے ظاہری احوال ہی سے جان لیا جا سکتا ہے، مگر یہ جاننا بالکل بھی ضروری نہیں ہوتا کہ وہ حقیقی طور پر کیا کافر ہیں یا نہیں۔

کسی کے لیے دعاے مغفرت کرنے اور اس کا جنازہ پڑھنے میں بھی ہمیں تکفیر کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ دعا ہر اُس شخص کے لیے کی جا سکتی ہے جو خدا کی طرف انابت اور رجوع لائے اور جنازہ ہر اُس شخص کا ہم پر حق ہے جو اپنے آپ کو مسلمان کہلائے، قطع نظر اس سے کہ وہ حقیقت میں مسلمان ہے یا نہیں ہے۔ البتہ، جو شخص اپنے آپ کو مسلمان نہیں کہتا وہ غیر مسلموں کے درجے میں چلا جاتا اور آپ سے آپ اس حق سے محروم ہو جاتا ہے اور ظاہر ہے اس بات کو جاننے کے لیے ہمیں کسی قدم پر بھی تکفیر کرنے کی ضرورت نہیں آن پڑتی۔ جن کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دعاے مغفرت کرنے اور ان کا جنازہ پڑھنے سے روک دیا گیا تھا، وہ اصل میں وہ لوگ تھے کہ جن کا نفاق اور کفر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مسلسل نافرمانی کی وجہ سے اب کھل کر سامنے آ چکا تھا۔ اور ہم جانتے ہیں کہ پیغمبر کے بعد ہم میں کوئی ایسا نہیں کہ جس کی نافرمانی خدا کے ہاں کفر اور نفاق کا عنوان قرار پاتی ہو یا اُسے خدا کی طرف سے لوگوں کے کفر کی اطلاع مل جانے ہی کا کوئی امکان ہو۔

## مسلم اور غیر مسلم

پچھلے مباحث میں ہم نے جانا کہ غامدی صاحب کے نزدیک کسی بھی شخص کو، وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم ہو، اس معنی

---

۳۳؎ البقرہ ۲: ۲۲۱۔

۳۴؎ یہ اجازت مردوں کے بجاے اہل کتاب کی عورتوں کے ساتھ ہی کیوں مخصوص ہے؟ اس کی تفصیل بیان کرنے کا یہ موقع نہیں۔

میں کافر قرار نہیں دیا جا سکتا کہ اُس نے حق بات کا جان بوجھ کر انکار کر دیا ہے۔ اس مبحث میں اب ہم یہ جانتے ہیں کہ اگر کسی شخص کو کافر قرار نہیں دیا جا سکتا تو پھر جو لوگ اسلام سے محروم ہیں یا اُس سے دور ہو گئے ہیں، اُن کی راے میں اُنھیں کیا کہا جائے گا؟ اس لحاظ سے یہ بحث دو عنوانات میں تقسیم کی جا سکتی ہے: ایک غیر مسلم اور دوسرے مسلم۔

## ۱۔ غیر مسلم

جو شخص اسلام کو مانتا ہے، قرآن میں اس کا نام مسلم رکھا گیا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جو شخص اسے نہیں مانتا اور کسی اور مذہب کا ماننے والا ہے یا وہ مذہب کا سرے سے انکاری ہے، اُسے ہم کیا نام دیں؟ کافر کا نام تو ہرگز نہیں دے سکتے کہ اس کے بارے میں تکفیر کے شرائط کا پورا ہو جانا بالکل محال ہے۔ البتہ، اس کے ظاہری احوال و اقرار کا لحاظ کرتے ہوئے ہم یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ وہ اسلام کو ماننے والا نہیں ہے۔ اسی بات کی تعبیر کے لیے ہم غیر مسلم کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ یہ کوئی خاص نام یا کوئی اصطلاح نہیں ہے اور نہ اسے کسی اِثباتی معنی کو ادا کرنے کے لیے وضع کیا گیا ہے، یہ مسلمانوں کے مقابلے میں محض تعارف کے لیے بولا جانے والا ایک لفظ ہے۔ کسی اور لفظ کے بجاے 'غیر مسلم' کا لفظ اس لیے زیادہ موزوں ہے کہ ہم اسے جس لفظ 'مسلم' کے مقابلے میں استعمال کر رہے ہیں وہ نہ تو مومن کے معنی میں ہے اور نہ فرماں بردار کے معنی میں ہے۔ وگرنہ ہم پہلی صورت میں غیر مسلم کے بجاے 'کافر' اور دوسری صورت میں 'عاصی' اور 'فاسق' وغیرہ کے الفاظ کو ترجیح دیتے۔ یہ اس لیے بھی زیادہ موزوں ہے کہ اس میں کسی کی ہتک یا طعن کا کوئی پہلو بھی نہیں پایا جاتا کہ لوگ، یہاں تک کہ غیر مسلم بھی اس پر معترض ہو سکیں۔ اس لیے کہ جو لوگ اسلام کا اقرار نہ کریں یا اسے صحیح دین ہی نہ سمجھیں، اُن کے بارے میں اگر یہ کہا جائے کہ وہ اس دین کے پیرو نہیں ہیں تو اس میں آخر اعتراض کی کیا بات ہو سکتی ہے؟ یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ مثال کے طور پر، مسیحی حضرات ہمیں غیر مسیحی کہیں تو یہ ہمارے لیے کسی قسم کی گالی اور بدزبانی نہیں، بلکہ سراسر حقیقت کا بیان ہوگا۔

یہاں یہ بات بھی یاد رہنی چاہیے کہ اس لفظ کو سندِ جواز فراہم کرنے کے لیے بالکل بھی ضروری نہیں ہے کہ ہم نصوص میں اس کا کوئی حوالہ تلاش کریں۔ اس لیے کہ کسی کو نام دینے کے لیے نص کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہوتی اور یہی وجہ ہے کہ ہم دیگر مذاہب کے ماننے والوں کو مخصوص ناموں، حتیٰ کہ اُنھی کے تجویز کردہ ناموں، یعنی ہندو، سکھ اور بدھ وغیرہ سے بلاتے ہیں اور اس پر کبھی بھی نص کا مطالبہ نہیں کرتے۔ چنانچہ اگر ہم کسی شخص کو ایک خاص مذہبی نام دے سکتے ہیں تو غیر مسلم کا نام بہ طریق اولیٰ دے سکتے ہیں کہ یہ اپنی حقیقت میں کچھ بھی نہیں، محض کسی ذات کے غیر کو

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

بیان کر دینا ہے۔ اور اس طرح کے بیان کا معروف طریقہ یہی ہوتا ہے کہ اُسے ''غیر'' کے ساتھ ترکیب دے دیا جائے، جیسا کہ مثال کے طور پر، ہم اللہ کے سوا تمام ہستیوں کو غیر اللہ کا نام دے دیتے ہیں۔ تاہم قرآن نے 'وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا'[35] کی آیت میں تو خاص اسلام کے مقابلے میں یہی ترکیب، یعنی ''غیر اسلام'' بیان بھی کی ہے کہ جس کے ہوتے ہوئے لفظ غیر مسلم کے لیے ایک حد تک نص کا دعویٰ بھی کیا جا سکتا ہے۔ ایک اور طریقے سے دیکھا جائے تو یہ غیر مسلم کا نام واضح طور پر خدا ہی کی طرف سے رکھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے کہ اسلام کو ماننے والوں کو 'هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ'[36] کہہ کر مسلم کا نام دینا، اس کا مطلب ہی یہ ہے کہ جو اسے نہ مانتا ہو، وہ اپنے نام کے لحاظ سے غیر مسلم ہوگا۔ مزید یہ کہ ایک مقام پر فرمایا ہے کہ جو تمھیں سلام کہے اُسے یہ نہ کہو: 'لَسْتَ مُؤْمِنًا'[37] کہ تم مسلمان نہیں ہو۔ غور کیا جائے تو یہ 'لَسْتَ' اصل میں ''غیر'' اور 'مُؤْمِنًا' اصل میں ''مسلم'' ہی ہے۔

## ۲۔ مسلم

یہودیت اور مسیحیت کے پیرو یہودی اور مسیح کہلاتے ہیں، اسی طرح ہر وہ شخص جو اسلام کو قبول کرے اور اُس کا اقرار کرے، اُسے مسلم کہا جاتا ہے۔[38] اس اقرار کے لیے شریعت میں کوئی خاص صورت مقرر نہیں کی گئی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اس کی ایک سے زائد صورتیں واقعہ میں آئیں۔ مثلاً کسی شخص نے آ کر سلام کر دیا، اُس نے 'أشهد أن لا إله إلا الله و أشهد أن محمدًا رسول الله' کہتے ہوئے توحید اور رسالت محمدی کی شہادت دے دی، یا اُس نے مسلمانوں کی اصل دعوت، یعنی 'لا إله إلا الله' کا اظہار کر دیا، ان سب صورتوں کو اُس کی طرف سے اسلام کا اقرار سمجھا گیا۔ اور یہ محض اُس کا اقرار ہی تھا جو اُس کے مسلمان ہونے کے لیے کافی جانا گیا۔ اس سے آگے بڑھ کر ہمارے ہاں جو نماز اور زکوٰۃ کو اس کی دو شرطوں کے طور پر بیان کر دیا جاتا ہے، واضح ہو کہ وہ مسلمان قرار دیے جانے کے نہیں، بلکہ اُن حقوق کو حاصل کرنے کے شرائط ہیں جن کا مطالبہ کوئی مسلمان اپنے اسلام کی بنیاد پر کر سکتا ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ کے زمانے میں جب خدا کی طرف سے عذاب کا فیصلہ سنا دیا گیا اور اس سے بچنے

---

۳۵؎ آل عمران ۳: ۸۵۔

۳۶؎ الحج ۲۲: ۷۸۔

۳۷؎ النساء ۴: ۹۴۔

۳۸؎ جیسا کہ 'هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا' کی آیت میں یہ نام اُنھیں دیا بھی گیا ہے (الحج ۲۲: ۷۸)۔

کا حق صرف اُسے دیا گیا جو اسلام کو قبول کر لے تو اب ہر اُس شخص سے جو مسلمان ہونے کا دعویٰ کرے اور اس طرح خدائی عذاب سے بچنے کا حق مانگے، اُس سے نماز اور زکوٰۃ ادا کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔ اسی طرح یہ دو شرطیں اُن مسلمانوں کے لیے بھی لازم قرار دی جا سکتی ہیں جو اسلامی ریاست سے مسلمان ہونے کی حیثیت سے اپنے حقوق کا تقاضا کریں۔

یہ بنیادی بات جان لینے کے بعد اب ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ کوئی مسلم کیا اپنے اس نام سے کسی وقت محروم بھی کیا جا سکتا ہے؟ غامدی صاحب جس رائے کے مؤید ہیں، وہ اس لحاظ سے نہایت مبنی بر عقل ہے کہ اس کے مطابق یہ نام اُسے جس بنیاد پر دیا گیا تھا، اُس بنیاد کے ڈھے جانے ہی پر وہ اس سے محروم کیا جا سکتا ہے[۳۹]۔ چنانچہ اُن کا کہنا ہے کہ جب تک وہ اپنے اس اقرار پر قائم رہے، ہم پر لازم ہے کہ ہم اُسے مسلم سمجھیں اور مسلم کہیں۔ کسی شخص کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اِس اقرار کو ماننے سے انکار کرے اور اُسے غیر مسلم قرار دے دے۔ یہ بات کہ یہ حق کسی کو حاصل نہیں ہے، اس کا ذکر قرآن میں اُس مقام پر ہوا ہے جہاں مسلمانوں کو قتال کے بارے میں ہدایت دیتے ہوئے فرمایا ہے: 'وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰٓی اِلَیْکُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا' (جو شخص تمھیں سلام کرے، اُسے یہ نہ کہا کرو کہ تم مسلمان نہیں ہو[۴۰])۔ وقتِ ملاقات سلام کرنا اسلام کا ایک شعار اور اس لحاظ سے اس دین کا اقرار کرنے کے مترادف تھا، چنانچہ مسلمانوں کو اس بات سے روک دیا گیا کہ وہ اسے ماننے سے ہرگز انکار نہ کریں۔ یہ انکار نتائج کے اعتبار سے کس قدر سنگین ہے، اس کا اندازہ کئی احادیث سے بھی بہ خوبی ہو جاتا ہے۔ مثلاً ایک مرتبہ اسامہ بن زید جہاد کے سلسلہ میں ایک سریہ کے ساتھ گئے۔ دشمن کے علاقے میں اُنھوں نے ایک شخص کو پکڑا تو اُس نے 'لا إله إلا الله' پڑھ دیا۔ یہ کلمہ اُس کی طرف سے اسلام کا اقرار تھا، مگر انھوں نے اسے تسلیم نہیں کیا اور اُس شخص کو قتل کر دیا۔ بعد میں یہ بات انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بیان کی اور اپنی طرف سے ایک معقول عذر بھی پیش کیا، مگر آپ نے اُن کے اس کام پر اس قدر نکیر فرمائی کہ اُسامہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے خواہش کی کہ میں آج کے دن اسلام لایا ہوتا کہ میرا یہ جرم اسلام قبول کرنے کی وجہ سے معاف کر دیا جاتا[۴۱]۔

---

۳۹؎ یہ وہی بات ہے جسے عام طور پر علما اس طرح بیان کرتے ہیں: 'ولا یخرج العبد من الإیمان إلا بجحود ما أدخله فیه' (شرح الطحاویہ ۱/۳۳۱)۔

۴۰؎ النساء ۴: ۹۴۔

۴۱؎ مسلم، رقم ۲۷۷۔

یہاں پھر ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ جو شخص اسلام کا اقرار کر رہا ہو، اگر اسلام کے خلاف عقیدے کا اظہار کرے اور اس کی روح کے منافی اعمال کا مرتکب ہو تو کیا پھر بھی اسے مسلم ہی کہا جائے گا اور اس نام سے محروم نہیں کیا جائے گا؟ غامدی صاحب اس کا جواب ہاں میں دیتے ہیں اور اصرار کرتے ہیں کہ مسلمان کو بہر صورت، چاہے وہ غیر اسلامی نظریات کا حامل اور صریح بداعمالی کا شکار ہو جائے، مسلمان ہی کہا جائے گا، اور ان کی اس بات کے پیچھے چند ایک وجوہ بہ آسانی سمجھ لیے جا سکتے ہیں:

ایک یہ کہ کسی شخص کو 'مسلم' کا لفظ نہ تو اُس کے حقیقی ایمان کی وجہ سے دیا جاتا ہے اور نہ اُس کی نیکی اور پرہیز گاری کی وجہ سے کہ اس میں کسی خرابی یا کمی کے در آنے پر اسے واپس لے لیا جائے۔ یہ محض ایک نام ہے جو ہر اُس شخص کو شناخت کے طور پر دیا جاتا ہے جو اسلام کے دائرے میں آنے کا اقرار کرے۔ اب ہونا تو یہی چاہیے کہ ہر مسلمان اپنے اِس نام کی لاج رکھے اور اپنے عقیدہ و عمل میں حقیقی معنوں میں مسلمان بننے کی کوشش کرے، لیکن اگر وہ اس طرح کا مسلمان نہیں بن پاتا تو سادہ سی بات ہے کہ اس سے اس کے نام کی نفی نہیں ہو جاتی، الّا یہ کہ وہ خود اس اقرار سے پیچھے ہٹ جائے اور اس کا انکار کر دے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

دوسرے یہ کہ مسلم کا یہ نام اُسے ظاہری اور قانونی طور پر مسلمان قرار دیتا ہے، حقیقی طور پر نہیں کہ ہم اس سلسلے میں اُس کی گمراہیوں اور بداعمالیوں کو پیش کرنے لگیں۔ قانون اور حقیقت میں پایا جانے والا یہی فرق ہے کہ مسلمان معاشرے کے تمام افراد ایمان و عمل میں باہم مختلف ہونے کے باوجود ایک جیسے نام، یعنی مسلمان سے پکارے جاتے ہیں۔ بلکہ منافقین کا معاملہ تو اس فرق کی نہایت واضح مثال ہے۔ یہ لوگ کفر و نفاق کے سرغنہ تھے اور اسلام کے خلاف اپنی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے اس لائق نہیں تھے کہ انھیں مسلمان کہا جاتا، مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اس سب کے باوجود انھیں مسلمان کہا گیا۔ قرآن میں بھی انھیں عام طور پر اُنھی لفظوں، یعنی 'یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا' سے خطاب کیا گیا کہ جن سے مومنین صالحین کو خطاب کیا جاتا تھا۔ اور صرف یہی نہیں کہ انھیں مسلمان کا نام دیا جاتا تھا، بلکہ انھیں مسلم معاشرے کا ایک فرد اور مسلمانوں کا ساتھی بھی قرار دیا جاتا تھا۔ ان کے فتنہ پردازوں میں سے ایک شخص نے جب اللہ کے پیغمبر کے بارے میں نازیبا کلمات کہے اور کچھ جاں نثاروں نے اس کے قتل کی اجازت مانگی تو آپ نے انکار کرتے ہوئے فرمایا: 'لا یتحدث الناس أن محمدًا یقتل أصحابہ' (ایسا نہ ہو کہ لوگ کہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ہی ساتھیوں کو قتل کرانے لگے ہیں[۴۲])۔ غرض یہ کہ ہر وہ شخص جو اسلام کا اقرار کرتا ہے، قطع نظر اس سے کہ

۴۲؎ بخاری، رقم ۴۹۰۵۔

اُس کے نظریات وعقائد اور اعمال کس طرح کے ہیں، وہ مسلم ہے، اس لیے کہ 'مسلم' کا یہ لفظ اُس کے لیے قانونی اور ظاہری لحاظ سے بولا جا رہا ہے نہ کہ حقیقی لحاظ سے۔ باقی جہاں تک کسی شخص کے حقیقی اسلام کا تعلق ہے تو اس بارے میں فیصلہ عالم کا پروردگار ہی سنا سکتا ہے اور وہ آخرت میں یہ فیصلہ ضرور سنائے گا۔

تیسرے یہ کہ کسی مسلمان کے نظریات وعقائد جس قدر بھی گمراہ کن ہو جائیں، وہ اُن کے لیے استدلال چونکہ اللہ ورسول کی ذات کو ماخذ مان کر کر رہا ہوتا ہے، اس لیے بھی لازم ہوتا ہے کہ اُسے مسلم کہا جائے کہ اُس کا یہ استدلال اصل میں دین اسلام کا اقرار کرنے کے مترادف ہوتا ہے۔ باقی جہاں تک ہدایت سے اُس کے اختلافات کا تعلق ہے تو وہ تاویل کے اختلافات ہیں جو دنیا میں اُس وقت تک موجود رہیں گے جب تک انسان کی عقل اور اس کے ارادہ و اختیار پر کوئی روک نہ لگا دی جائے۔ ان کی بہت بڑی مثال قرآن وحدیث کے سمجھنے میں ہونے والے اختلافات ہیں۔ مثال کے طور پر، ایک عالم کے نزدیک قرآن کا کوئی لفظ، جیسا کہ 'وَيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ' کی آیت میں 'وَجْه' کا لفظ اپنے حقیقی معنی میں آیا ہے اور اس کا مطلب ہے: خدا کا چہرہ[۴۳]۔ دوسرے کے نزدیک یہ اپنے مجازی معنی میں آیا ہے اور اس سے مراد خدا کی ذات ہے۔ اسی طرح کا معاملہ 'يَد'، 'ساق'، اور 'کرسی' وغیرہ کا مفہوم سمجھنے میں ہوا ہے اور اس نوعیت کے اختلافات بالعموم متکلمین کے درمیان میں واقع ہوتے ہیں۔ یہ اختلافات مفسرین کے ہاں بھی پائے جاتے ہیں۔ مثلاً، ایک مفسر کے ہاں کوئی لفظ، جیسا کہ 'النَّاس' قرآن میں ہر مقام پر اپنی عمومیت کے ساتھ استعمال ہوا ہے اور اس کا مطلب ہے ساری دنیا کے انسان۔ دوسرے کے نزدیک یہ لفظ تخصیص میں بھی چلا جاتا ہے اور اس وقت اس سے مراد کچھ مخصوص انسان ہوتے ہیں۔ فقہا کے درمیان میں پائے جانے والے اختلافات کا بھی یہی معاملہ ہے۔ مثلاً کسی فقیہ کے نزدیک کوئی حکم، جیسا کہ 'وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ'، کچھ مخصوص ہستیوں کے لیے خاص ہے اور بعض کی رائے میں یہ مبنی بر علت ہے، اس لیے ہر ایک تک ممتد ہو گیا ہے[۴۴]۔ اصولیین کے ہاں بھی یہی صورت حال ہے۔ شرک وتوحید، عبادت اور بدعت جیسی بنیادی اصطلاحات کا مفہوم طے کرنے میں بھی ان کے مابین اچھا خاصا اختلاف ہو جاتا ہے۔ غرض یہ کہ یہ سب حضرات جب آپس میں اختلاف کر رہے ہوتے ہیں تو اپنے موقف کی سند میں چونکہ اللہ ورسول کی بات نقل کر رہے ہوتے ہیں، اس لیے ان کے تمام اختلافات، بہر حال تاویل کے دائرے میں رہتے ہیں[۴۵] اور انھیں دائرۂ اسلام سے باہر نہیں جانے دیتے۔ تاہم، یہ بات صحیح ہے کہ مختلف الرائے

---

۴۳؎ الرحمٰن ۵۵: ۲۷۔

۴۴؎ الاحزاب ۳۳: ۳۳۔

فریقین کے بارے میں یہ بالکل نہیں کہا جا سکتا کہ وہ دونوں حق پر ہیں، ان میں کوئی ایک لازم ہے کہ غلطی پر ہو اور بعض صورتوں میں ہو سکتا ہے کہ وہ صریح گمراہی میں بھی جا پڑا ہو۔ چنانچہ ضروری ہے کہ جو شخص جس بات کو غلط سمجھتا ہو، وہ اُسے ضرور غلط کہے۔ شرک و کفر اور فسق و ضلالت جیسے گناہوں کو انھی ناموں سے بیان کرے اور اس سلسلے میں کسی مداہنت کو ہرگز راہ نہ دے۔ ان کی سنگینی کے بارے میں لوگوں کو متنبہ کرے اور ان سے باز رہنے کی پرزور تلقین بھی کرے۔

مذکورہ بالا تینوں نکات اس بات کو بالکل واضح کر دیتے ہیں کہ ہر وہ شخص جو اسلام کا اقرار کرے، وہ مسلمان ہے، اس لیے کہ 'مسلم' کا یہ لفظ اسے حقیقت کے اعتبار سے نہیں، بلکہ قانونی اعتبار سے اور محض شناخت کے طور پر دیا گیا ہے جو اُس سے اُس وقت تک نہیں چھینا جا سکتا جب تک وہ اپنے اقرار پر قائم رہے اور اللہ و رسول کی بات سے استدلال کرتا رہے۔ یہی وجہ ہے کہ غامدی صاحب اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ بہت سے مشاہیر اسلام اپنے عقائد کی کجی اور ان میں در آنے والے شرک و کفر کے باوجود مسلمان ہیں اور کسی کو حق نہیں کہ وہ انھیں غیر مسلم قرار دے اور انھیں مسلمانوں کی جماعت سے الگ کر دے۔ اُن کے الفاظ یہ ہیں:

''اِس کے بعد اُن لوگوں کا معاملہ ہے جو مسلمان ہیں، اپنے مسلمان ہونے کا اقرار، بلکہ اُس پر اصرار کرتے ہیں، مگر کوئی ایسا عقیدہ یا عمل اختیار کر لیتے ہیں جو عام طور پر اسلام کی تعلیمات کے منافی سمجھا جاتا ہے یا کسی آیت یا حدیث کی کوئی ایسی تاویل اختیار کر لیتے ہیں جسے کوئی عالم یا علما یا دوسرے تمام مسلمان بالکل غلط سمجھتے ہیں، مثلاً امام غزالی اور شاہ ولی اللہ جیسے بزرگوں کا یہ عقیدہ کہ توحید کا منتہاے کمال وحدت الوجود ہے یا محی الدین ابن عربی کا یہ نظریہ کہ ختم نبوت کے معنی یہ نہیں ہیں کہ نبوت کا مقام اور اُس کے کمالات ختم ہو گئے ہیں، بلکہ صرف یہ ہیں کہ اب جو نبی بھی ہو گا، وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کا پیرو ہو گا یا اہل تشیع کا یہ نقطۂ نظر کہ مسلمانوں کا حکمران بھی مامور من اللہ ہوتا ہے جسے امام کہا جاتا ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اِس منصب کے لیے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا تقرر اِسی اصول کے مطابق خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے کر دیا گیا تھا جسے قبول نہیں کیا گیا یا علامہ اقبال جیسے جلیل القدر مفکر کی یہ راے کہ جنت اور دوزخ مقامات نہیں، بلکہ احوال ہیں۔

یہ اور اِس نوعیت کے تمام نظریات و عقائد غلط قرار دیے جا سکتے ہیں، اِنھیں ضلالت اور گمراہی بھی کہا جا سکتا ہے، لیکن اِن کے حاملین چونکہ قرآن و حدیث ہی سے استدلال کر رہے ہوتے ہیں، اِس لیے اُنھیں غیر مسلم یا کافر قرار

---

۴۵؎ اس ذیل میں جو تاویل سائغ کی شرط لگائی جاتی ہے، وہ بھی بے جا ہے۔ اس لیے کہ یہ ایک اضافی امر ہے اور کس کی تاویل سائغ ہے اور کس کی غیر سائغ، سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس بات کا فیصلہ ہر دو فریق میں سے کون کرے گا؟

نہیں دیا جا سکتا۔ اِن نظریات وعقائد کے بارے میں خدا کا فیصلہ کیا ہے؟ اِس کے لیے قیامت کا انتظار کرنا چاہیے۔ دنیا میں اِن کے حاملین اپنے اقرار کے مطابق مسلمان ہیں، مسلمان سمجھے جائیں گے اور اُن کے ساتھ تمام معاملات اُسی طریقے سے ہوں گے، جس طرح مسلمانوں کی جماعت کے ایک فرد کے ساتھ کیے جاتے ہیں۔ علما کا حق ہے کہ اُن کی غلطی اُن پر واضح کریں، اُنھیں صحیح بات کے قبول کرنے کی دعوت دیں، اُن کے نظریات وعقائد میں کوئی چیز شرک ہے تو اُسے شرک اور کفر ہے تو اُسے کفر کہیں اور لوگوں کو بھی اُس پر متنبہ کریں، مگر اُن کے متعلق یہ فیصلہ کہ وہ مسلمان نہیں رہے یا اُنھیں مسلمانوں کی جماعت سے الگ کر دینا چاہیے، اِس کا حق کسی کو بھی حاصل نہیں ہے۔ اِس لیے کہ یہ حق خدا ہی دے سکتا تھا اور قرآن وحدیث سے واقف ہر شخص جانتا ہے کہ اُس نے یہ حق کسی کو نہیں دیا ہے[۴۶]۔''

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

۴۶؎ جاوید احمد غامدی، مسلم اور غیر مسلم، ماہنامہ اشراق، اکتوبر ۲۰۱۵ء، صفحہ ۱۹۔